SIR SYED AHMED KHAN KE MAZAMEEN WO MIQALAAT KA TAUZIHI ISHARIYAH

DISSERTATION

A dissertation submitted to the University of Hyderabad in partial fulfilment of the requirement for the award of degree of

MASTER OF PHILOSOPHY

Submitted by:

SABIHA BANU

Under the Supervision of:

Dr. RAFIA BEGUM

Asst. Professor, Dept. of Urdu

Department of Urdu,

School of Humanities

University of Hyderabad,

Hyderabad - 500046

June 2019

سرسید احمد خان کے مضامین و مقالات کا توضیحی اشاریہ

مقالہ برائے ماسٹر آف فلاسفی (اردو)

مقالہ نگار:

صبیحہ بانو

نگران:

ڈاکٹر رفیعہ بیگم

شعبہ اردو، اسکول آف ہیومانٹیز

یونیورسٹی آف حیدرآباد

حیدرآباد۔500046

جون 2019

DECLARATION

I **SABIHA BANU** hereby declare that the this Thesis entitled **"Sir Syed Ahmed Khan Ke Mazameen wo Miqalaat ka Tauzihi Ishariyah"** submitted by me under the guidance and supervisioin of **Dr. RAFIA BEGUM** is a bonafide research work which is also free from plagiarism. I also declare that it has not been submitted previously in part or in full on this University or any other University or Institution for the award of any degree or diploma. I hereby agree that my thesis can be deposited in Shodhganga / INFLIBNET.

Dated:

Name: **SABIHA BANU**

Signature of the Student

Regd. No. 17HUHL11

Signature of the Supervisor

(Counter Signature)

Department of Urdu

School of Humanities,

University of Hyderabad

Hyderabad - 500 046

CERTIFICATE

This is to certfity that the Thesis entitled **"Sir Syed Ahmed Khan Ke Mazameen wo Miqalaat ka Tauzihi Ishariyah"** submitted by **SABIHA BANU** bearing **Reg. No. 17HUHL11** in partial fulfillment of the requirmeents for the award of degree **Master of Philosophy** in Urdu is a bonafide work carried out by her under my supervision and guidance.

The dissertation has not been submitted previously in part or in full to this or any other University or Institution for the award of any Degree or Diploma.

Signature of the Student.

(Signature of the Supervisor)

Counter Signature

Head, Dept. of Urdu

Dean, School of Humanities

فہرست

شمار	عنوان	صفحہ
1	پیش لفظ	03
2	پہلا باب: سر سید احمد خان ۔ حیات اور علمی و ادبی خدمات	08
3	دوسرا باب: سر سید احمد خان کے مضامین و مقالات کا توضیحی اشاریہ	25
4	ماحصل	132
5	کتابیات	139

پیش لفظ

اللہ کے نام سے شروع کرتی ہوں جو نہایت ہی رحم والا ہے۔ جو ساری کائنات کا مالک ہے جس نے انسان کو غیر معمولی صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا اور لاکھوں درود وسلام پیارے نبی ﷺ پر جس کیلئے یہ ساری کائنات تخلیق کی گئی۔

تحقیق میں موضوع کا انتخاب سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ادب کا گہرا تعلق زندگی سے ہے ادب زندگی کی مصوری کا نام ہے اور تنقید حیات بھی۔ادب نہ صرف ایک تخلیقی حقیقت ہے بلکہ وہ انسان کے فکر واحساس کے تجربات اور تاثرات کا ترجمان بھی ہے۔ادب درحقیقت فنکار کی ذات اور اس کے گردو پیش کے ماحول کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

کوئی بھی تحقیق حروف آخر نہیں ہوتی اور خاص کر جب تحقیقی مقالے کی بات کی جائے تو اس میں سب سے بڑا مسئلہ موضوع کا ہوتا ہے۔جس کو مقررہ وقت میں پایہ تکمیل پر پہنچانا ضروری ہوتا ہے۔ایم۔فل کے مقالے کی تیاری بظاہر بہت آسان کام لگتا ہے۔لیکن جب کام شروع کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک فکر انگیز مرحلہ ہے اور مقالہ نگار اس وقت کن کن پریشانیوں سے دوچار ہوتا ہے۔مقالے عنوان کی مناسبت سے مواد کی فراہمی میں مقالہ نگار کے ساتھ ساتھ نگران کا بھی اہم رول ہوتا ہے۔جس کی وجہ سے مقالہ کی تیاری میں سہولتیں حاصل ہوتی ہے۔

ادبی تحقیق میں مواد کی فراہمی مختلف کتابوں پر منحصر ہوتی ہے کیونکہ مختلف کتابیں محقق کی نظر میں ہوتی ہے۔اوران کے دامن میں مواد کے گوہر آبدار پوشیدہ ہوتے ہیں۔لیکن ان تک رسائی

ریگستان میں پانی تلاش کرنے کی مانند ہے۔مواد کی جستجو میں ایک ریسرچ اسکالر اپنی کتاب پر نظر کرم فرمائیں یہ ممکنات میں سے نہیں ہے کیونکہ اس کے لیے کافی عرصہ درکار ہوتا ہے ہے ایسے مشکل اوقات میں اسکالر کی رہنمائی کتابوں پر کیا گیا اشاریہ کرتا ہے جو اسے بتاتا ہے کہ اس کا مطلوبہ مواد کہاں موجود ہے۔

اشاریہ کا لفظ عربی زبان سے لیا گیا ہے جس کے لغوی معنیٰ کتاب کی فہرست ہے انگریزی زبان میں اشاریہ کو Index کہا جاتا ہے۔اشاریہ کو حروف تہجی کے لحاظ سے ہی ترتیب دیا جاتا ہے تاکہ کتاب پڑھنے والے ان تمام مضامین اور مصنفین سے فوری طور پر واقف ہوسکیں ۔جس کا تفصیلی ذکر اس کتاب میں کیا جاتا ہے۔اس لیے اشاریہ سازی کا م کافی محنت طلب ہوتا ہے۔

اشاریہ ترتیب دینے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کتاب کے قاری کو ان تمام مضامین اور مصنفین کی فوراً معلومات حاصل ہوجائے جن کا مفصل ذکر اس کتاب میں شامل ہوتا ہے۔دیکھا جائے تو اشاریہ مرتب کرنا اتنا دشوار کن نہیں ہوتا ہے لیکن اشاریہ سازی کے لیے کافی محنت کی ضرورت درکار ہوتی ہے۔اور جس موضوع اور کتاب کے مضمون کو لے کر اشاریہ ترتیب دیا جارہا ہے اس سے بھر پور واقفیت ضروری ہوتی ہے۔تب ہی مکمل طریقے سے اشاریہ سازی کی تکمیل کی جاسکتی ہے۔

جہاں تک اُردو مضامین کے اشاریہ سازی کا تعلق ہے وہ ایک تحقیق طلب معاملہ ہے میں نے اپنے اس مقالے کو دو (2) ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا باب : سرسید احمد کی حیات، علمی وادبی خدمات کا مختصراً جائزہ۔

دوسرا باب : سرسید احمد خان کے مضامین ومقالات کا توضیحی اشاریہ

ماحصل

پہلے باب میں سرسید احمد خان کی حیات وسیرت کے علاوہ علمی وادبی خدمات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔سرسید احمد خان کو ابتداء ہی سے لکھنے پڑھنے کا ذوق تھا۔سرسید احمد خان کی سب سے پہلی علمی وادبی خدمات سید الاخبار پرچہ 1835ء میں مضمون نویسی کے ذریعہ ہوئی تھی۔اوراس طرح سرسید احمد خان نے ملک گیر شہرت بحثیت مقالہ نگار حاصل کی۔

دوسرے باب میں سرسید احمد خان کے مضامین ومقالات کا توضیحی اشاریہ کیا گیا ہے۔کہ کس طرح اپنے مضامین اور مقالات کے ذریعہ سرسید احمد خان نے اردو زبان کے علم وادب کی ترقی اورقوم کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا۔اورقوم کوغربت وافلاس سے باہر نکالنے کے لئے اپنے قلم کے ذریعہ بے پناہ کوشش کرتے رہے ہیں۔اوروہ بڑی حدتک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

اس کے علاوہ مجموعی جائزہ میں مقالے کے تمام ابواب کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے تاکہ قاری کواس کے مطالعے سے تمام مقالے کا اجمالی خاکہ ذہن نشین ہوجائے۔

مقالے کے آخر میں کتابیات کے تحت ان کتابوں اور رسالوں کی فہرست دی گئی ہے جو اس مقالے کو لکھنے کے سلسلے میں معاون ومددگار ثابت ہوئے ہیں۔

مواد کی تلاش اور چھان بین کے سلسلہ میں راقم نے اندرا گاندھی میموریل لائبریری یونیورسٹی آف حیدرآباد اور مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری سے استفادہ کیا ہے۔اسکے علاوہ شہر کے مختلف علمی وادبی تنظیموں سے بھی استفادہ کیا گیا۔

مقالہ نگار کا ایک اہم فریضہ ہوتا ہے کہ وہ ان تمام احباب کا شکریہ ادا کرے جنہوں نے اس مقالے کی تکمیل میں اہم رول ادا کیا ہے۔

اس مقالے کی تکمیل کے سلسلے میں جن حضرات کا تعاون پیش رہا ہے ان میں سب سے

پہلے صدر شعبہ اردو محترم پروفیسر حبیب نثار صاحب کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ جنہوں نے ہمیشہ میری رہنمائی کی اور مجھے دوران تحقیق بہت سے نامعلوم باتوں سے آشنا کیا۔ جو دوران تحقیق بہت ہی ضرورت کی حامل تھی۔

میں اپنی نگران ڈاکٹر رفیعہ بیگم صاحبہ کی بے حد شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مقالے کی تیاری میں برابر میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی۔ ان کی رہنمائی کی وجہ سے آج یہ مقالہ مکمل ہو پایا۔ ایک شاگرد اپنے استاد کا حق کبھی ادا نہیں کرسکتا ہے۔ بس میں ان کے حق میں دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت انہیں جزائے خیر نصیب فرمائے۔

میں شعبہ کے دیگر اساتذہ اکرام کی بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے اس مقالے کی تکمیل کے دوران مجھے قیمتی مشوروں سے نوازا۔

میں اپنے والدین کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں جن کی دعاؤں کے طفیل میرا یہ کام تکمیل کو پہنچا اور جنہوں نے اعلیٰ تعلیم کیلئے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی۔ خاص کر میرے والد صاحب نے میرے تعلیمی سفر کے ہر موڑ پر میرا بھرپور ساتھ دیا۔ اور آج میں والد کی پدرانہ شفقت کی بدولت اس مقام پر پہونچنے کے قابل بن پائی۔ اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ والدین کا حق اولاد کبھی ادا نہیں کرسکتے۔ تو میری کیا بساط کہ میں اس بارے میں سوچ سکتی ہوں لیکن ہاں زندگی بھر میں اپنے شفیق والدین کے حق میں دعا گو رہونگی اور ہمیشہ رب العزت سے دعا کرتی رہونگی کہ میرے والدین کی صحت وتندرستی کو برقرار رکھتے ہوئے ان کا سایہ سلامت رکھے۔ آمین

اس کے علاوہ میں ان تمام رفیقوں اور ساتھیوں کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے ہر قدم پر اپنا تعاون فراہم کیا خاص کر میری دوست ساجدہ کی ممنون ومشکور ہوں جس نے میرا ساتھ مقالے کی تکمیل تک دیا۔

آخر میں اس بات کا اعتراف کر لینے میں مجھے کوئی عار نہیں کہ کوئی بھی تحقیق حروف آخر نہیں ہوتی! اس موضوع پر آئندہ کام کرنے والے اشخاص اور محققین بہتر مواد فراہم کر سکیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ میں نے اپنی بساط بھر اس موضوع پر مواد فراہم کرنے کی کوشش کی ہے

☆☆☆

پہلا باب

سرسید احمد خان

حیات اور علمی و ادبی خدمات

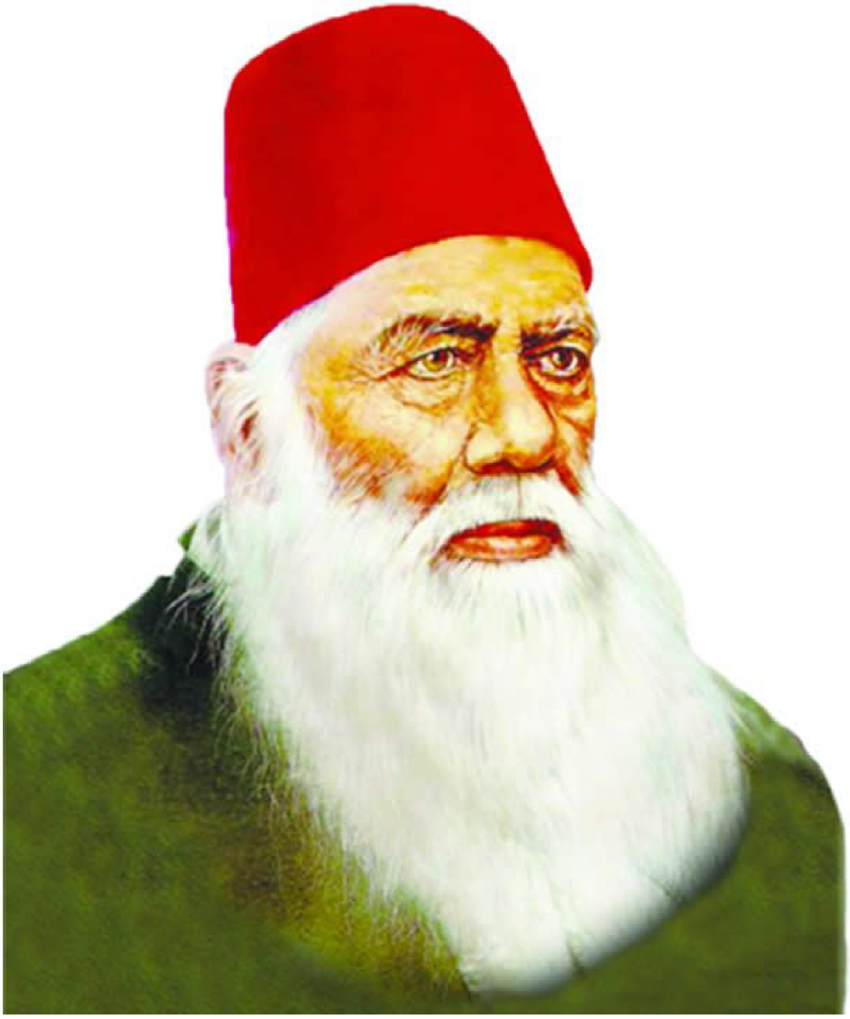

سرسید احمد خان

17/ اکتوبر 1817ء تا 27/ مارچ 1898ء

سر سید احمد خان 17 ؍اکتوبر 1817ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ یہ نہایت معزز اور شریف خاندان سے تھے۔ ان کے اسلاف عرب سے مغل شہنشاہ شاہ جہاں کے عہد حکومت میں ہندوستان تشریف لائے۔ اور شاہانِ دہلی کے دربار میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوتے رہے۔ ان کے والد میر متقی قانع بزرگ اور ان کی والدہ عزیز النساء نہایت خوش سلیقہ تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ان کے یہاں ایک لڑکی صفیۃ النساء اور 2 بیٹے پیدا ہوئے۔ بڑے لڑکے کا نام سید محمد رکھا اور چھوٹے بیٹے کا نام سید احمد۔ بچہ عموما اپنی ماں سے زیادہ مانوس ہوتا ہے اور ماں کا اثر زیادہ قبول کرتا ہے۔سید احمد کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔انہوں نے خود اعتراف کیا کہ:

> ''میری والدہ کیسی عالی خیال اور نیک صفات اور عمدہ اخلاق، دانشمند اور دوراندیش فرشتہ صفت بی بی تھیں اور ایسی ماں کا ایک بیٹے پر جس کی اُس نے ترتیب کی ہو۔کیا اثر پڑتا ہے۔''(1)

سر سید احمد خان کی تعلیم کا آغاز روایتی انداز میں ہوا۔شاہ غلامؔ علی نے بسم اللہ پڑھائی اور ایک اُستانی سے ناظرہ قرآن پڑھا۔ پھر مولوی حمید الدینؔ سے آمد نامہ، خالق باری اور گلستان و بوستان کا درس لیا۔عربی میں شرح ملا۔شرح تہذیب اور مختصر معانی پڑھیں۔ان کی طبیعت ابتداء سے ہی کسی ایک کتاب یا موضوع پر قناعت کرنے والی نہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے علم طب اور علم ریاضی کی طرف بھی توجہ کی۔حکیم حیدرؔ خاں سے طب کی کتابیں پڑھیں۔لیکن علم کی شدید پیاس ان قطروں سے نہ بجھ سکی۔ وہ ہمہ وقت مطالعہ میں غرق رہنے لگے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دلّی میں ذوقؔ، غالبؔ، صہبائیؔ، آزردہؔ، شاہ نصیرؔ، مومنؔ اور شیفتہؔ کی شاعری کا چرچا تھا۔سر سید نے بھی ان مشاہیرے سے کسبِ فیض کیا۔

سرسید احمد خان 19 سال کے ہوئے تو ان کی شادی 1836ء میں نقیب الاولیا خاندان کی بیٹی پاکیزہ بیگم عرف مبارک بیگم سے کر دی گئی جو نہ صرف یہ کہ ایک معزز علم پرور گھرانے سے تعلق رکھی تھی بلکہ خود بھی پڑھی لکھی تھیں۔ چنانچہ تا حیات وہ کبھی اپنے شوہر کے علمی اور اصلاحی کاموں میں روکاوٹ نہیں کی۔ سرسید احمد خان کے بڑے بیٹے کا نام سید حامد اور چھوٹے بیٹے کا نام محمود تھا۔ اور بیٹی کا نام آمینہ تھا۔

سرسید احمد خان کی عمر 21 سال تھی کہ ان کی والدہ کا 1838ء میں انتقال ہو گیا۔ اور ایسی زمانے میں سیاسی حالات کی بناء پر انہوں نے مغل دربار سے وابستہ ہونے کے بجائے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کرنے کا ارادہ کیا۔ خاندان کے سارے افراد نے اُن کے اس عزم کی مخالفت کی لیکن دھن کے پکے اور ارادے کے مضبوط ہونے کی وجہ سے وہ اپنی بات پر اڑے رہے۔ سرسید نے اپنے خالو صدر امین خلیل اللہ خان کی اعانت سے دہلی کی کچیری میں کام سیکھ کر جلا منصبی معاملات سے خاصی واقفیت حاصل کر لی۔ خلیل اللہ خان نے اپنی کچہیری (متعلقہ فوجداری کے خفیف مقدمات) میں میر منشی، ہیڈ کلرک کے عہدے پر ملازم کروا دیا۔ جب رابرٹ ہمکٹن آگرہ کے کمشنر مقرر ہوئے تو انہوں نے سرسید احمد خان کو وہاں پر بلا لیا۔ اور فروری 1839ء میں نائب منشی کے عہدے پر تقرر کر دیا۔ جہاں انہوں نے قوانین مال سے واقفیت پیدا کی اور محنت سے کمشنری کے دفتر کو ترتیب دے کر روزمرہ کے کاموں کا دستور العمل بنایا۔

سرسید احمد خان نے نہ صرف کسب معاش پر اکتفا کیا بلکہ دوسرے اشغال بھی ان کی توجہ کا مرکز رہے۔ اور کوئی نہ کوئی اعلیٰ خیال یا مشغلہ ان کی زندگی کا مقصد بنا رہا۔ ان کو اپنے دادیہال اور ننہیال سے لکھنے پڑھنے کا شوق وراثتاً ملا تھا۔ جس کو سرسید نے نہ صرف باقی رکھا بلکہ اوڑھنا اور بچھونا بنا لیا۔ جن دنوں وہ آگرے میں نائب منشی کے منصب پر فائز تھے۔ سرسید احمد نے ایک رسالہ

''جامِ جم'' کے نام سے تصنیف کیا جو 1840ء میں شائع ہوا۔اس میں امیر تیمور سے بہادر شاہ ظفر تک بادشاہوں کے حالات درج ہیں۔

سر سید احمد خان 24/ڈسمبر 1841ء میں مین پوری کے مصنف ہوئے اور وہاں سے فتح پور سیکری اور اس کے بعد دہلی آئے۔1842ء میں بہادر شاہ نے جوادالدولہ عارف جنگ کا خطاب عطا کیا۔1857ء میں مستقل صدر الصدور بنا کر بجنور بھیجے گئے۔1858ء میں مرادآباد کی سب ججی پر ممتاز ہوئے اور غازی پور، علی گڑھ، بنارس سب ججی کی خدمات انجام دینے کے لئے بھیجے گئے۔ یکم/اپریل 1866ء میں بنارس چھوڑا اور ولایت کا سفر کیا۔6/اگست 1868ء کو گورنمنٹ انگریزی سے سی۔ایس۔آئی کا خطاب اور تمغہ عطا ہوا۔2/اکٹوبر 1870ء کو ہندوستان واپس آئے اور 24/مئی 1875ء کو مدرستہ العلوم علی گڑھ کی بنیاد ڈالی۔1876ء میں نہایت نیک نامی اور عزت کے ساتھ آپ نے پنشن لی اور اپنے آپ کو قومی خدمات کیلئے وقف کر دیا۔

بنارس سے وہ اگست 1876ء میں مستقل طور پر علی گڑھ منتقل ہو گئے اور اپنے مکان میں مقیم ہوئے۔جسے سید محمودؔ نے خرید کر مرمت کے بعد ضروری فرنیچر سے آراستہ کر دیا تھا تا کہ ان کے والد آرام سے رہ سکیں۔بانی تعلیم نسوانِ شیخ عبداللہ ان کے معمولات زندگی کے متعلق لکھا ہے کہ۔

> ''سر سید صبح چار بجے اٹھ جاتے تھے۔اُن کے پلنگ کے پاس جو میز رکھی تھی۔اس پر ایک موم بتی جلا کر رکھ دیتے تھے۔اور اس کی روشنی میں کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے یا مضامین لکھا کرتے تھے۔جاڑوں میں دو گھنٹے اس شغل میں صرف کرتے تھے۔اس کے بعد غسل خانے جاتے پھر چائے نوش فرماتے اور پھر ایک بڑی میز کے پاس بیٹھ کر تصنیف کا کام شروع کر دیتے تھے۔''(2)

انہوں نے نہ صرف ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیمی صورت کو بہتر بنانے کی کوشش کی بلکہ طلبہ کے بیرون ملک یعنی انگلستان میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے راستہ ہموار کیا۔ 1883ء میں محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن'' بنایا تا کہ ان طلباء کے لئے جو سول سروس کے امتحان میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ سفر خرچ اور تعلیم کے لئے روپیہ مہیا کیا جا سکے۔ لیکن یہ ادارہ کچھ عرصوں میں بعد عدم فعالیت کی بناء پر ترک کر دیا گیا۔

سر سید احمد خان نے 1886ء محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ قائم کی۔ جس کا مقصد ملک کے دیگر حصوں کی تعلیمی صورت حال سے واقف ہونا تھا۔ لارڈ ڈفرن نے سید احمد کو 1887ء میں سول سروس کمیشن کا رکن مقرر کیا۔

اگست 1888ء میں انہوں ں ے'' پیٹریا ٹک ایسوسی ایشن'' بنائی تا کہ ہندوستانیوں کے خیالات کو جو نیشنل کانگریس میں شامل نہیں تھے۔ حکومت تک پہنچایا جا سکے۔ 1889ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف لاء کی اعزازی سند دی۔

آخر عمر میں انہیں چند ناخوشگوار تجربات کا سامنا کرنا پڑا پہلا واقعہ ٹرسٹی بل 1889ء سے متعلق تھا۔ جس کی متعدد دفعات میں سے ایک یہ بھی تھی کہ سید محمود کالج کے جوائنٹ سکریٹری مقرر کیئے جائیں تا کہ سید احمد خان کے بعد وہ کالج کے سکریٹری ہوسکیں ان کے دماغی توازن پر لوگوں کو شبہ ہونے لگا تھا۔ اس لئے اس کی مخالفت قدیمی دوست سمیع اللہ خان نے کی۔ اور ان کا ساتھ وقار الملک نے بھی دیا۔ کثرت رائے سے یہ بل تو منظور ہو گیا۔ مگر دونوں دوستوں کے درمیان جو فاصلہ پیدا ہو گیا وہ تا حیات باقی رہا۔ کالج کے روپئے میں غبن کا واقعہ بھی پریشان کن تھا۔ 1895ء میں سکریٹری کے دفتر کے ہیڈ کلرک شیام بہاری لال نے مختلف طریقوں سے کثیر رقم غبن کی۔ اس

نے سر سید احمد خان کے جعلی دستخط کر کے روپئے غائب کیئے۔ اس حادثہ سے کالج کی ترقی کا منصوبہ کچھ عرصے کے لئے رک گیا۔اوراس کاان پر گہرااثر ہوا۔

1897ء میں اپنے بیٹے سید محمود کی علالت (اختلال دماغ) کا رنج بھی برداشت کرنا پڑا۔ اس سے پہلے بڑے لڑکے سید حامد کا انتقال ہوا جو سپر نٹنڈنٹ پولیس تھے اور لندن کے دوران قیام چھوٹی بیٹی آمینہ کی موت کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ان سانحات نے عرصہ تک انہیں غمگین رکھا۔

ان ناسازگار حالات کے باوجود سرسید احمد خان کے قوائے ذہنی مضمحل نہیں ہوئے اور وہ آخری ایام تک قوم و ملک کی اصلاح میں مصروف رہے۔ انہوں نے اپنے طریقے فکری کی وضاحت کی کہ مذہب کو انہوں نے تقلید اور وراثت سے نہیں عقل کی روشنی میں دیکھا ہے۔ وہ جدید علم کلام کے بانی ہیں۔

ضعیفی اور ناتوانی کے باوجود جب تیسری بار اردو زبان اور فارسی رسم الخط کا مسئلہ سامنے آیا تو انہوں نے حکومت کو متنبہ کیا کہ وہ اردو دشمنی کی پالیسی کو ترک کردے ورنہ اس کے نتائج اچھے نہ ہوں گے۔ مرض الموت ہی میں انہوں نے عیسائی کی تصنیف ''اُمہات المومنین'' کی تردید میں جواب بہ عنوان ''ازواج مطہرات'' لکھنا شروع کیا جو مکمل نہ ہوسکا۔

سرسید احمد خان انتقال سے 19 روز قبل سید محمود کے مکان حاجی اسماعیل خان رئیس وتاولی کی کوٹھی میں منتقل ہوگئے تھے۔ وہیں 24/ مارچ سے ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی۔ اور 27/ مارچ 1898ء بروز اتوار دس بجے شب رحلت کی۔ اور مدرستہ العلوم علی گڑھ کالج کی مسجد کے بیرونی حصہ میں دفن ہوئے۔

سرسید احمد خان کی موت کسی ایک شخص کی موت نہیں بلکہ ایک عہد کا خاتمہ تھا۔ان کی زندگی

کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کا ایک باب ختم ہوگیا۔ بقول حآلی وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے۔

''میری لائف سوائے اس کے کہ لڑکپن میں خوب کبڈیاں کھیلیں،
کنکوئے اڑائے، کبوتر پالے ناچ مجرے دیکھے اور بڑے ہوکر نیچری،
کافر اور بے دین کہلائے اور رکھا ہی کیا ہے۔''(3)

ان کی شخصیت کا حیرت انگیز کمال یہ تھا کہ انہوں نے قوم اور پورے دور کو متاثر کیا چنانچہ انہوں نے ذہین وفطن اشخاص کو ایک جگہ جمع کیا اور اپنے طرز فکر اور قوتِ عمل سے ان کی شخصیتوں کو ایسی جلا بخشی کہ ان کی چمک دور اور دیر تک پھیلتی رہی۔

سر سید احمد خان کی متعدد تصانیف ہیں۔جن کا موضوع تواریخ، دینیات اور اخلاقیات وغیرہ ہے۔ان میں سے اہم آثار الصنادید، جلاء القلوب (مولفہ 1842ء، م1258ھ)، تحفہ حسن (مولفہ 1844ء، م1160ھ)، فوائد الافکار (1864ء)، قول متین، کلمتہ الاحق (1846ء)، راہ سنت (1850ء) وغیرہ ہیں۔قرآن مجید کی تفسیر بھی کی تھی جو صرف نصف ہی ہوسکی اور اُن کی طبیعت خراب ہوگئی۔اس کے علاوہ انہوں نے بہت سے علمی اور فلسفیانہ مضامین رسالہ تہذیب الاخلاق کے لیے لکھے تھے۔

سر سید احمد خان بہت ہی ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے وہ ایک زبردست مصنف، بلند خیال مفکر، جلیل القدر مصلح اور مدبّر تھے۔ان میں ایک ایسی کشش تھی جو دوسروں کو اپنا ہم خیال بنا لیتی تھی۔یہی وجہ ہے کہ ان کے رفقائے کار میں نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، نواب اعظم یار جنگ، شمس العلماء مولانا حآلی، مولانا شبلی، ڈاکٹر نذیر احمد اور مولوی ذکا اللہ جیسی قابل ہستیاں شامل تھیں۔

سرسید احمد خان کی علمی وادبی خدمات

سرسید احمد خان نے اپنی علمی وادبی زندگی کا آغاز تاریخ نویسی سے کیا۔ ان کی تحریر ہمیں تعصب اور تنگ نظری سے بالاتر تاریخی شعور کا پتہ دیتی ہیں۔

1835ء میں اخبارات کو آزادملی۔ اس سال سرسید کے بڑے بھائی سید محمود خان نے دہلی سے سید الاخبار جاری کیا۔ سرسید کی سب سے پہلی علمی وادبی خدمات اس اخبار میں مضمون نویسی کے ذریعہ ہوئی۔ ان کی کتابوں کی تفصیل درج ذیل ہے۔

1. **جامِ جم (فارسی)**: ملازمت آگرہ کے زمانے میں سرسید احمد خان نے فارسی زبان میں ایک فہرست بطور نقشے کے مرتب کی۔ اس میں امیر تیمور سے بہادر شاہ ظفر تک 43 بادشاہوں کا مختصر حال لکھا یہ 1840ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔

2. **جلاء القلوب بذکر المحبوب**: مولفہ 1846ء، م 1258ھ مولود شریف کی محفلوں میں پڑھنے کے لئے سرسید نے اس رسالہ میں اس زمانے کے خیالات کے موافق صحیح روایتیں درج کیں۔

3. **تحفہ حسن**، مولفہ 1844ء، م 1160ھ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کی تصنیف تحفہ اثنا عشریہ کے باب دہم و دوازدہم کا ترجمہ۔ یہ رسالہ اہل طشی کی تردید میں لکھا تھا۔ اس کے بعد سرسید نے کبھی شیعہ عقائد واعمال طبقہ سے تعرض نہیں کیا۔

4. **تسہیل فی جزاالثقیل** ،مطبوعہ 1844ء،ابوذر یمنی کے عربی رسالہ سے کسی عالم بوعلی نے فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔اور معیار العقول نام رکھا تھا۔سرسید نے فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔اس رسالہ میں جزاالثقیل کے 5اصول بیان کئے ہیں۔یعنی بھاری چیزیں اٹھانے ،سخت چیزوں کے چیرنے،دبانے نچوڑنے کے لیے5 کلین بتائی ہیں۔

5. **آثارالصنادید:** یہ کتاب سرسید احمد خان کا نہایت ہی نادر کارنامہ و یادگار ہے۔اس میں عمارات بیرون شہر، لال قلعہ وعمارات قلعہ،عمارات شہر دہلی،یعنی حویلیوں ،مسجدوں مندروں، بازاروں باولیوں، کنوؤں وغیرہ کے تعمیری حالات،ان کے نقشہ تصویریں، کتبے، دہلی کے پرانے شہروں،قلعوں،محلوں کا بیان، پھر مشاہیر اہل دہلی کا حال لکھا ہے۔جس میں ایک سو بیس مشائخ ، علماء،فقراء،مجاذیب،اطباء،قرا،شعراء،خوش نویس،مصور،موسیقی داں وغیرہ کا بیان ہے۔''آثار الصنادید'' کا پہلا ایڈیشن ڈیڑھ برس کے اندر اندر 1847ء،م1263ھ میں چھپ کر تیار ہو گیا۔ اس کی عبارت سرسید احمد خان نے مولوی امام بخش صہبائی سے لکھوائی تھی۔اس لیے رنگین و مقفی تھی۔سلیس و رواں نہ تھی۔دوسرا ایڈیشن 1854ء میں چھپ کر شائع ہوا۔تیسرا ایڈیشن منشی رحمت اللہ خان نے اپنے نامی پریس کانپور میں 1904ء میں شائع کیا۔جس میں پہلے دونوں ایڈیشنوں کی خوبیاں جمع کر دیں۔

6. **تاریخ ضلع بجنور:** جنوری1855ء میں سرسید احمد خان صدر امین ہو کر بجنور گئے وہاں کلکٹر کی فرمائش سے ضلع بجنور کی تاریخ مرتب کی۔کلکٹر نے اس کو گورنمنٹ میں بھیج دیا۔ابھی وہاں سے واپس نہ آئی تھی کہ ہندوستان میں غدر شروع ہو گیا۔اور وہ غالباً آگرہ میں غدر کے سبب سے تلف ہوگئی۔

7. **تصحیح آئین اکبر:** شہنشاہ مغلیہ اکبر اعظم (1554ء تا1605ء،م963 تا1014ھ) کے

وزیر و مشیر ابوالفصل (1602ء) نے اصول و طریق سلطنت پر آئین اکبری لکھی تھی۔ اس کی فارسی زبان بالکل نئے طرز کی تھی۔ جس میں عربی کے الفاظ کم تھے۔ اوراسلوب بیان دشوار فہم تھا۔ کاتبوں کے بے پروائی سے اس کتاب میں غلطیاں بہت تھیں۔ سرسید احمد خان نے بجنور میں ایک تاجر دہلی حاجی قطب الدین کی فرمائش سے آئین اکبری کی تصحیح کی۔ پہلی اور تیسری دو جلدیں 1856ء میں شائع ہوگئی۔ دوسری جلد کی تصیح میں دشواریاں تھیں۔ اس لیے اس کو موخر رکھا گیا۔ جب اس کی صحت مکمل ہوئی اور مطبع میں بھیجی گئی تو غدر شروع ہو گیا۔ اور وہ ضائع ہوگئی۔ دہلی کے نامور لوگوں نے آئین اکبری پر تفریظیں لکھی تھیں۔

8. **تاریخ سرکشی بجنور:** مراد آباد آ کر لکھی اس میں 1857ء سے اپریل 1858ء تک کے حالات و واقعات غدر جو بجنور میں گذرے بقید تاریخ نہایت تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ اس میں بہت سی تحریریں اور یاداشتیں ایسی ہیں کہ جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید ابتداء سے اخیر تک اس کتاب کے لیے مواد جمع کرتے رہے تھے۔ ایسی حالت میں جب کہ جانوں کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ انگریزی عمل داری بالکل اٹھ گئی تھی۔ لوگوں کے گھر بار لٹ رہے تھے۔ اور خود سرسید احمد خان نہایت خوف و ہراس کی حالت میں تھے۔ وہ ان کا غزات اور یاداشتوں کی بحفاظت رکھتے جاتے تھے۔

9. **رسالہ اسباب بغاوت ہند:** مراد آباد ہی میں یہ رسالہ بھی 1858ء میں لکھ کر چھپوایا یہ بھی سرسید احمد خان کی ملکی خیر خواہی، قومی محبت اور اخلاقی جرات کی یادگار ہے۔ ہنگامہ غدر میں گورمنٹ عموماً اہل ہند سے اور خصوصاً مسلمانوں سے بدظن ہوگئی تھی۔ سب سے زیادہ تباہیاں مسلمانوں پر آئی تھیں۔ سرسید نے اس کتاب میں غدر کو حکومت کی خامیوں اور خرابیوں کا نتیجہ ثابت کیا۔ اور تمام بدتدبیروں اور سختیاں گنائی ہیں۔

10. رسالہ لائل محمڈنز آف انڈیا: غدر کے بعد گورنمنٹ کی چشم غضب سب سے زیادہ مسلمانوں کی طرف تھی۔ ان کی غداری کا ہر جگہ چرچا تھا اور وفاداری کا کہیں ذکر نہ تھا۔ اس لیے سرسید نے مسلمانوں کے حالات کا ایک سلسلہ اس نام سے جاری کیا۔

11. تحقیق لفظ نصاریٰ: اسی زمانے میں سرسید احمد خان کو جب یہ معلوم ہوا کہ حکومت لفظ نصاریٰ کے استعمال کو بغاوت کا مترادف سمجھتی ہے۔ اور ان مسلمانوں کو جو اپنی تحریروں میں اس لفظ کا استعمال کرتے ہیں۔ سزائیں دے رہی ہے تو انہوں نے انگریزوں کی غلط فہمی رفع کرنے کے لیے قرآن وحدیث اور لغت کی روشنی میں اس لفظ کی تشریح کی اور بتایا کہ اس کا استعمال اصولاً کسی جذبہ نفرت یا شائبہ مخالفت کا حاصل نہیں۔ (4)

12. تاریخ فیروز شاہی مصنفہ ضیا برنی: یہ کتاب سلاطین ہند کی مستند تاریخ ہے۔ مصنف سلطان محمد تغلق اور فیروز شاہ کا معاصرہ تھا۔ سرسید نے اس کو ایشیاءٹک سوسائٹی بنگال کی فرمائش پر ایڈٹ کیا۔ اس کے شروع میں ایک دیباچہ لکھ کر شائع کیا۔ سوسائٹی نے 1863ء میں شائع کی۔

13. تبیین الکلام: یہ تصنیف بھی سرسید احمد خان نے قومی محبت، تدبّر و دانش مندی، شوق علم و تحقیق، ہمت و استقلال کا عجیب وغریب نمونہ ہے۔ یہ کتاب مرادآباد میں شروع ہوئی اور غازی پور میں تکمیل تک پہنچی۔ اس میں انجیل اور قرآن مجید کی اصولی وحدت ثابت کی گئی ہے۔ اور جہاں دونوں میں اختلافات نظر آتے ہیں ان میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ (5)

14. احکام طعام اہل کتاب (1868ء): مسلمانون کے دلوں سے انگریزی معاشرت کی نفرت دور کرنے اور انگریزوں کے ساتھ کھانے پینے کی عادت ڈالنے کے لئے یہ رسالہ لکھا۔ اور قرآن وحدیث سے اہل کتاب کے کھانے کو جائز ثابت کیا۔ سرسید احمد خان نے خود پہلے ہی سے انگریزوں کے ساتھ

کھانا پینا شروع کر دیا تھا۔مسلمانوں نے حسب عادت اس پر بھی بڑی لے دے گی۔

15. **سفرنامہ لندن:** سر سید احمد خان نے اس سفرنامہ میں ہر ایک دلچسپ حال جو اثنائے راہ میں پیش آیا ہے قلم بند کیا ہے یوروپ کے عجائبات ایسے طور پر بیان کئے ہیں۔جس سے پڑھنے والوں کو یوروپ کے سفر کی ترغیب ہو۔

16. **خطبات احمدیہ:** سر سید احمد خان کی مذہبی خدمات ماضی و مستقبل میں بہترین خدمات بہ تصنیف ہے۔اس سے پہلے جتنی کتابیں لکھیں ''اسباب بغاوت''تبیین الکلام والکلام وغیرہ وہ بھی قوم و مذہب کے سوز و گداز کا نتیجہ تھیں۔لیکن ان میں دنیا کے مقاصد وفوائد کا خیال بھی شریک تھا۔''خطبات احمدیہ'' خالص اسلامی خدمت تھی۔کے بعد سر سید احمد خان نے تفسیر القرآن لکھی اور وہ بھی دینی خدمت اوراس سے زیادہ مہتم بالشان خدمت تھی۔

'خطبات احمدیہ' کی ضرورت و اہمیت اوراس کی تالیف کے لیے سر سید احمد خان کی کوشش و کاوش کا اندازہ مولانا حالؔی کے اس بیان سے ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں اسلام تین خطروں سے گھرا ہوا تھا۔ایک طرف مشنری ان پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ان کی منادیوں میں اخباروں اور رسالوں میں زیادہ تر بوچھاڑ اسلام پر ہوئی تھی۔اسلام کی برائیاں اور بانی اسلام پر نکتہ چینیاں ان کی تقریر وتحریر کا موضوع تھا۔اور بعض جاہل و مفلس مسلمان ان کے دام میں آجاتے تھے۔دوسرے مسلمان اس نظر سے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلش قوم نے مسلمانوں سے لی تھی۔ ہمیشہ حکمراں قوم کی نگاہ میں کھٹکتے تھے۔اور انگریز مسلمانوں کے مذہب کو بغاوت وفساد کا سرچشمہ اور امن و عافیت کا دشمن خیال کرتے تھے۔تیسرے مذہب اسلام کو انگریزی تعلیم اور مغربی علوم و فنون کی طرف سے خطرہ تھا جو روز بہ روز ہندوستان میں پھیلتے جاتے تھے۔اور جن سے

ہندوستانیوں کو کسی طرح مفر نہ تھا۔ یہاں تک کہ خود سر سید احمد خان کو یہ تعلیم پھیلانی پڑی اندیشہ تھا کہ مسلمانوں کے دل میں اسلام کے عقائد و اعمال اور اصول و قوانین کی طرف سے غلط فہمی پیدا ہو جائے۔

17. رسالہ ابطال غلامی: یہ مضمون اگر چہ بقدر ضرورت ''خطبات احمدیہ'' میں لکھا جا چکا تھا۔ مگر ولایت سے آنے کے بعد سر سید احمد خان نے اس مضمون پر ایک مستقل رسالہ لکھ کر اول تہذیب الاخلاق میں شائع کیا۔ اور پھر علیحدہ کتاب کی شکل میں چھپوایا۔ علماء اسلام کو تو یہ بھی احساس نہ تھا کہ بردہ فروشی کا دستور جو عرب وافریقہ میں جاری ہے۔ اس میں کیا برائی ہے۔ اور وہ اصول اسلام کے موافق ہے یا نہیں۔ اور اس کی بھی پرواہ نہ کی کہ عیسائی قومیں اسلام پر بڑا طعن کرتی ہے کہ اس نے لونڈی غلام بنانا جائز کیا ہے۔ اگر چہ اٹھارویں صدی تک یوروپ وامریکہ میں بھی غلامی کی رسم جاری تھی اور وہاں غلاموں کی جو حالت زار تھی۔ اس بے رحمی اور سنگدلی کی اسلام میں کہیں نظیر نہیں پائی جاتی لیکن انیسویں صدی سے وہاں غلامی کا بالکل انسداد ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ لوگ اسلام پر اعتراض کرنے میں دلیر تھے۔ سر سید احمد خان پہلے شخص ہیں جنہوں نے نہایت مدلّل طریقے سے ثابت کیا کہ اسلام نے اول اول غلاموں کے ساتھ حسن سلوک اور آزاد کرنے کی ترغیب دی اور پھر اس رسم کو بالکل ممنوع کر دیا۔

18. تفسیر القرآن: سر سید احمد خان نے قرآن مجید کی تفسیر لکھنے میں کمال جسارت سے کام لیا۔ ان کے پیش نظر وہی خطرے تھے جو ''خطبات احمدیہ'' کے لکھنے کا باعث ہوئے تھے۔ وہ یہ تھے کہ نوجوان مسلمان مغربی فلسفہ وسائنس پڑھ کر اسلام کے عقیدہ قانون کو عقل سے جانچیں گے اور عقل کے موافق نہ پانے کے سبب سے اسلام سے دور ہو جائیں گے۔ اس لیے سر سید احمد خان نے یہ طئے کر لیا کہ اسلام کے عقیدے پر قانون، ہر حکم، ہر قصہ کو عقل کے مطابق ثابت کیا جائے اور جو اس

کسوٹی پر کھرا نہ نکلے اس کو ٹکسال باہر کر دیا جائے۔ سر سید احمد خان کا یہ خیال صرف ایک حد تک درست تھا یعنی اسلام کی بہت سی باتیں عقل انسانی اور قدرت کے قوانین مسلمہ کے بالکل موافق ہے۔ بلکہ جملہ مذاہب عالم میں صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے جس کی صداقت وفضیلت کی علم اور عقل و تجربہ نے ہمیشہ تصدیق کی ہے۔ لیکن نفس مذہب ایسی چیز ہے جس میں بعض ان دیکھی اور بن سمجھی باتوں کے ماننے بغیر کام نہیں۔ سر سید احمد خان نے اپنی تفسیر میں قرآن کے اور مسائل کی تشریح و توجیہ میں البتہ کارنمایاں کیا ہے۔ اسی طرح ارکان و فرائض، اسلام نماز، روزہ، حج وغیرہ کے مصالح بیان کئے ہیں جہاد اسلام کی تشیرح اس قدر واضح مدلّل طریقہ سے کی ہے کہ اس پر انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اسی طرح تعدد ازدواج، طلاق، غلامی وغیرہ احکام کی تفسیر قول فیصل کا حکم رکھتی ہے۔

تفسیر القرآن کی پہلی جلد 1880ء، م 1297ھ میں چھپ کر شائع ہوئی اور اس کے بعد وقتاً فوقتاً اور جلدیں شائع ہوتی رہیں۔ نصف قرآن سے کچھ ہی زیادہ کی تفسیر لکھنے پائے تھے کہ پیغام اجل آ پہنچا اور چھ جلدیں چھپی ہوئی آخر سورۃ بنی اسرائیل تک اور ایک جلد بن چھپی سورۃ انبیاء تک، اور چند چھوٹے چھوٹے رسالے مثل۔ **تفسیر السموت ازالته اليقين عن قصته ذى القرنين ترفيم فى قصته اصحاب كهف و الرقيم**، جن کو تفسیر کے علاوہ سمجھنا چاہئے۔ سر سید احمد خان کی یادگار رہ گئے۔

19. النظر فی بعض المسائل: چند مسائل اسلامی و قرآنی پر بحث کی ہے۔

20. سفرنامہ پنجاب: علی گڑھ کالج کی کوشش کے سلسلہ میں سر سید احمد خان نے 1884ء میں پنجاب کا سفر کیا۔ وہاں انہوں نے جو لکچر دیئے اور تقریریں کی۔ وہ سب برجستہ و برمحل زبانی تقریریں تھیں لیکن سید اقبال علی کی حیرت انگیز زود نویسی کے سبب قلم بند ہو گئے۔

21. **جواب امہات المومنین:** یہ گویا سرسید احمد خان کی آخری تصنیف ہے۔ کسی دیسی عیسائی نے حضرت رسول اکرم ﷺ کے تعداد وازدواج پر اعتراض کیا۔ اور ''امہات۔ المومنین'' کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا۔ سرسید احمد خان نے باوجود ضعف ومرض کے اس کا جواب لکھا۔

22. **مضامین تہذیب الاخلاق:** سرسید احمد خان کا یہ رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' تین دفعہ کر کے 11/12 برس جاری رہا۔ اس میں اور لوگوں نے بھی مضامین لکھے۔ لیکن سب سے زیادہ سرسید احمد کے مضامین ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے سب مضامین علیحدہ چھاپ دیئے گئے ہیں۔ اور یہ بھی سرسید کی ایک تصنیف ہے۔ یہ رسالہ اُردو کا پہلا رسالہ نہ تھا۔ اس سے پہلے درجنوں رسالے نکل چکے تھے۔ اور نکل رہے تھے۔ لیکن مضمونوں اور اور مضمون نگاروں دونوں نگاروں دونوں کے لحاظ سے ہندوستان کا بہترین پرچہ تھا۔

23. **خطوط سرسید کے پوتے مرحوم سرداس مسعود (نواب مسعود جنگ)**

متوقع 1937ء نے چند سال ہوئے ان کے خطوط کا مجموعہ شائع کر دیا غالب کے بعد سر سید پہلے شخص ہیں جن کے خطوط زبان وادب اور علم وعلم کے نقطہ نظر سے دلکشی اور افادہ کا گنجینہ ہیں۔ ان میں نجی خطوط شامل ہے۔ اور قومی وملکی مذہبی معاملات کے متعلق بھی صرف ان خطوط سے بھی ہم سرسید کی سیرت واخلاق کا صحیح واصلی نقشہ مرتب کر سکتے ہیں۔

سرسید کے مجموعہ مضامین میں زبان، طرز بیان، مضمون کی ایسی رنگارنگی، اتنی جدّت، اس قدر دل کشی ہے کہ بغیر مطالعہ کے اندازہ دشوار ہے۔ اس میں مذہبی، قومی، اخلاقی، اصلاحی، ہمہ اقسام کے مضامین ہیں۔ اور ان کے اسلوب نگارش میں فکر و احساس، منطق و فلسفہ، جوش و خروش، شوخی وظرافت ہر رنگ کا حسب موقع جلوہ ہے۔

حواشی:

1. سرسید احمد خان اوران کا عہد،ازثریا حسین
2. سرسید احمد خان اوران کا عہد۔از: ثریا حسین،ص:41
3. دیباچہ حیات جاوید،ص:28
4. سرسید اوراُن کے نامور رفقاء۔از: سید عبداللہ ص:20
5. سرسید اوران کے نامور رفقاء۔سید عبداللہ،ص:22-20

دوسرا باب

سرسید احمد خان

کے مضامین و مقالات کا توضیحی اشاریہ

مضمون:

علمی وادبی لحاظ سے اپنے بہترین خیالات کو دل نشین پیرائے میں لکھنا مضمون نویسی ہے۔ گویا مضمون ایک وسیع معنوں میں استعمال ہونے والی ایسی صنف ہے جس کے ذریعہ ہر قسم کے معلومات کو دوسروں تک پہونچایا جاسکتا ہے۔ جدید دور میں ہر وہ دلچسپ تحریر جو اپنی جگہ مکمل اور جامع ہو اور تسلسل و روانی سے پیش کی گئی ہو اسے مضمون کہا جاتا ہے۔ ایسی تحریر کے لئے ضروری ہے کہ خیالات کو ترتیب و سلیقے سے پیش کیا جائے۔ ماسٹر رام چندر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے انہوں نے مضمون نگاری کے نمونے پیش کئے تھے۔ ماسٹر پیارے لال اور ذکا اللہ نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔

مضمون کے موضوعات کو محدود نہیں کیا جاسکتا بالفاظ دیگر دنیا کی کسی بھی نوعیت کی ہر چھوٹی بڑی چیز کے لئے مضمون لکھا جاسکتا ہے۔ اور کسی بھی قسم کے نظریات پیش کیئے جاسکتے ہیں۔ بلکہ ایک بنیادی خیال کو حقائق و تاثرات کی روشنی میں وسعت دی جاسکتی ہے۔ دراصل مضمون کی روح اسلوب یا طرز نگارش میں مضمر ہوتی ہے۔ اور یہ طرز بیان محض الفاظ کی جادوگری نہیں ہے۔ اظہار کی جدت، خیالات کی ندرت الفاظ کا موزوں ومناسب استعمال، موضوع سے متعلق تفصیل رعنائی وسلاست جیسی خوبیاں مضمون کی تاثیر میں اضافہ کا باعث ہوتی ہیں۔ مضمون شخصی بھی ہوتے ہیں۔ اور غیر شخصی بھی، اکثر مضمون نگار نتائج کو مبہم یا ادھورا چھوڑ دیتے ہیں یا پھر ذاتی اور انفرادی تجربات کی پیشکشی میں موضوع سے دور ہوجاتے ہیں۔ عموماً صحافتی اور رسمی نوعیت کے مضامین میں یہ انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ ویسے کسی بھی مضمون میں معلومات کا فراہم کرنا اس کا خاص وصف ہے۔ کسی

بھی مضمون کے تین حصے قرار دیئے گئے تمہید، نفس موضوع اور اختتام، ان تین باتوں میں مناسب، توازن اور سلیس انداز کا اختیار کرنا مضمون نگاری کا بنیادی اصول ہے۔

مضمون نویسی کی کئی اقسام ہیں۔علمی و ادبی لحاظ سے ہر عنوان پر مضمون لکھا جاسکتا ہے۔ جیسے خالص علمی، ادبی، اخلاقی، مذہبی، تاریخی، سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی، تحقیقی، تنقیدی، سوانحی، تخلیقی، تجرباتی، تاثراتی، طنز و مزاحیہ، المیہ، توصیفی، تجارتی، تعمیری، تجریدی اور تصوراتی وغیرہ وغیرہ۔اس کے علاوہ سائنسی مضامین بھی اپنا ایک وزن و وقار رکھتے ہیں۔

کسی موضوع پر اپنے خیالات کو خوب سوچ سمجھ کر یکجا کرنا اور ترتیب و تنظیم سے پیش کرنا مضمون نویسی کہلاتی ہے۔مضمون نگار کو چاہئے کہ قابل فہم الفاظ کا استعمال، گویا سیلیس اور سیدھی سادی زبان میں لکھنا چاہئے۔ بسا اوقات یہ بآسانی سمجھ میں آنے والے الفاظ دقیق اور بڑے بھاری بھرکم الفاظ سے زیادہ اثر پیدا کرتے ہیں۔سہل الفاظ کے برعکس ثقیل اور علامتی انداز کے لفظوں سے جہاں تک ہوسکے پرہیز کرنا چاہئے۔

مضمون نویسی کا انداز بیان یا طرز نگارش صاف ستھرا ہونا چاہئے۔سوالیہ اور استعجابیہ جملوں وفقروں سے بھی دور رہنا چاہئے۔ گویا ایک خاکہ بنالیا جائے کہ مضمون میں کیا کیا باتیں لکھنا ضروری ہیں کس بات کو اولیت دینا ہے۔اور کس کی تشریح ہوگی اور کس کو بعد میں یا آخر میں درج کیا جانا ہے۔اس طرح ابتداء، وسط اور انتہا کے ساتھ ساتھ درمیانی ربط و تعلق کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے۔اس طرح مضمون کا اختتام بھی صاف واضح ہو، نا تمام مضمون یا نتیجہ کے بغیر مضمون کی کوئی اہمیت نہ ہوگی۔مختلف موضوعات پر لکھے گئے مضامین کی نوعیت اور ان کے نتائج مختلف ہوں گے مگر ان میں اختتام کا طریقہ موضوع کی مناسبت سے طئے ہونا چاہئے۔

مقالہ:

مقالہ میں حقائق کی بازیافت کی جاتی ہے۔اس میں شواہد، تجزیہ اور تاثرات کا دیانت داری سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔اور استدلالی گفتگو کی روشنی میں نتائج اخذ کیئے جاتے ہیں۔مقالہ میں موضوع سے متعلق مفید معلومات بہم پہنچانے کے ساتھ ساتھ مباحث کی گنجائش موجود ہوتی ہے جس کی وجہ سے مقالہ کافی طویل ہوجاتا ہے۔مقالہ کی تکمیل کے لئے کافی چھان بین، تحقیق اور تنقید کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔موضوع کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ اور پھر خود مقالہ نگار کے زاویہ فکر کا اندازہ اہم قرار پاتا ہے۔تاہم مقالہ نگار کی شخصیت دبی سی دبی رہے گی۔مقالہ دراصل عربی کے مقاصد کی صورت سے جدا نہیں۔مقالے کا بنیادی وصف علمیت اور افادیت ہے اس کے ذریعے جستجو ولگن کی راہیں متعین ہوتی ہے۔کسی بھی موضوع پر سیر حاصل گفتگو کا سلیقہ وشعار ملتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ تحریر میں احتساب واحتیاط کا فریضہ دستیاب ہوتا ہے۔مقالے میں سنجیدگی ، وقار اور تدبر کا احساس اجاگر ہوتا ہے۔مقالے موضوع کی مناسب سے طویل اور مختصر ہوتے ہیں۔طوالت کے معنی یہ نہیں ہے کہ ہزاروں صفحات تک بات پھیلائی جائے۔غیر ضروری اور ذیلی باتوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا بھی مقالہ نگاری کا عیب ہے۔

سرسید احمد خان کے مضامین اور موضوعات:

سرسید کی شخصیت انیسویں صدی عیسوی کی ایک ہمہ جہت، ہمہ رنگ، ہمہ پہلو شخصیت ہے ۔جس نے برصغیر کے مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ پر گہرے اور دیرپا نقوش چھوڑے۔1857ء کے بعد مسلمانوں کی پستی، زوال، تہذیبی وثقافتی لحاظ سے نکبت وافلاس کا دور دورہ تھا۔ان کا جو قدم بھی اٹھتا وہ بدحالی گروات پست ہمتی کا عنوان بن جاتا۔تعلیم سے دوری، آداب معاشرت میں

کجی ،ظلمت واندھیرے کے ہمراہ کے ایسے قصوں میں سرسید نے قوم کا ہاتھ پکڑا، اس کے سود و بہبود پر نگاہ ڈالی ،صلاح وفلاح کی ایک وسیع تحریک شروع کی۔اس ضمن میں انہوں نے اپنا مشہور و معروف رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا گویا گھٹاٹوپ اندھیرے میں ایک ننھا سا دیا جلایا جس کی ہلکی ٹمٹاتی روشنی نے اپنی جھلملاہٹ سے لوگوں کو راستہ بجھادینے کا حوصلہ دیا۔مسلمانوں کی سیاسی و تہذیبی زندگی میں گراوٹ کے جہاں کئی محرکات رہے وہیں مذہب بھی ایک تھا۔اس وقت مذہب میں نے نئے خیالات ،منفی تصورات ، باطل رجحانات ،متزلزل اعتقادات کی آمیزش شروع ہوچکی تھی۔اوہام پرستی کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کے خرافات کی زیادتی نے مسلمانوں کو پریشان کردیا تھا۔سرسیدان کی اصلاح چاہتے تھے۔

اسلام ایک ترقی پسند،فطرت پسند مذہب ہےاس میں جمود کی گنجائش نہیں، اجتہاد کی راہیں ملتی ہیں۔اسلام کے حقیقی نام لیواؤں نے صداقت شعار، رواداری،مساوات، جمہوریت، آزادی اورانسانیت نوازی کی خاطر بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں۔سرسید کے مذہبی افکار، ان کا شعور،فکری تانے بانے حرکیاتی ترقی پسندی سے عبارت ہیں۔سرسید کے زورقلم کا نتیجہ ایسی بہت ساری تحریریں ہیں۔جن کی وجہ سے اردوادب میں انقلاب برپا ہوا۔چنانچہ سرسید کے مضامین کی نوعیت اصلاح ،انسانیت، خدمت، اسلام کی سربلندی،حقائق کی وضاحت ،تہذیب وثقافت کا تحفظ وغیرہ سے جدانہیں۔انہوں نے آثارالصنادید، جام جم (فارسی میں امیر تیمور سے بہادر شاہ ظفر تک کوئی 43 مغل بادشاہوں کے احوال) تصیح آئین اکبری، تاریخ سرکشی بجنور، رسالہ اسباب بغاوت ہند، محقیق لفظ نصاری، لائل محمڈنز آف انڈیا، تصیح تاریخ فیروز شاہی اور خطبات احمدیہ میں وقت کی ضرورت کے مطابق مضامین لکھے۔یہ مضامین اکثر رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' میں چھپتے رہے۔ ان مضامین کے مطالعے سے یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ سرسید کو ملک وملت مذہبی رواداری نیز

ادبی کاموں سے کس قدر دلچسپی تھی۔ سرسید کی تحریروں میں اس بات کی شعوری قدریں ملتی ہیں۔ جس کے تحت انسانی زندگی اپنی خصوصیات سے نزدیک نظر آتی ہے۔ انسانی ذہن کی روشنی اس کے ادراک کی پہنچان بن جاتی ہے۔ انسانی ذہن کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ آزادرہ کرغوروفکر کرلے۔ کہا جاتا ہے کہ فطرت کا ذہن جمادات، نباتات، حیوانات میں سویا ہوا تھا۔ مگر انسانی ذہن کی صورت میں جاگ اٹھا۔ سرسید نے اس حقیقت کو جان لیا تھا اس لیئے انہوں نے ادب کی توسط سے قوم کو بیدار کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس کے ذریعے قوم کو عزم وحوصلہ مصائب سے نبرد آزما ہوکر زندہ رہنے کی روایت کا آغاز کیا۔ چنانچہ سرسید کے قدم بہ قدم چلنے والوں کا ایک قافلہ تیار ہوا اور کئی ادیب ونثر نگار اس کارواں میں شریک ہوئے۔

سرسید احمد خان کے مضامین میں انگریزی الفاظ کی کثرت ملتی ہے انہوں نے ایسے انگریزی الفاظ کثرت سے استعمال کئے ہیں۔ جن کی مترادفات اردو میں نہایت آسانی سے مل سکتے ہیں۔ شاید یہ زمانے کا رجحان تھا جو ان کے رفقاء میں بھی پایا جاتا ہے سرسید کی تمام تحریروں میں خلوص اور صداقت بہت نمایاں ہے۔ اس کی وجہ سے عبارت میں ایک قسم کی گرمی اور اثر پیدا ہوجاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ پگھل کر ایک دوسرے سے پیوست ہوگئے ہیں۔

مضامین ومقالات کی خصوصیات:

سرسید احمد خان کے مضامین و مقالات مسلمانوں کی ہمدردی سے لب ریز ہوتے ہیں۔ جن میں دکھاوا اور نمائش قطعاً نہیں ہوتی ہے۔ ان کی عبارت عموماً دل نشین اور اور موثر ہوتی ہے۔ مضامین میں بالعموم عربی فقرات، قرآنی آیات اور احادیث نبوی کا بہ کثرت استعمال کرتے ہیں۔ ساتھ ہی فارسی اشعار، ضرب الامثال اور محاورات بھی کم نہیں ہوتے۔ اپنے مضامین میں ہر جگہ اگر

چنانچہ مغربی تہذیب اور یوروپین شائستگی کے گن گاتے ہیں مگر قدیم مشرقی طرز معاش کا بھی خاص لحاظ رکھتے ہیں اور ساتھ ہی بے ہودہ مراسم اور جاہلانہ معتقدات کے سخت مخالف ہیں اور مضامین میں اُن کا رد ہر جگہ بڑی سختی کے ساتھ کرتے ہیں۔ سرسید کے بیش تر مضامین نہایت دل سوزی کی نصیحتوں اور بلند ترین اخلاق نکات اُن کے مضامین میں اس قدر زیادہ ہے کہ اگر اُن کو ان کی تمام تالیفات اور اخباروں رسالوں سے لے کر ایک جگہ جمع کیا جائیت تو وہ ہماری درستی اخلاق کے لیے بہترین دستور العمل بن سکتے ہیں۔ جس موضوع پر وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اُس کے لئے مناسب پیرایہ بیان اختیار کرتے ہیں۔ سرسید کے مضامین میں بالعموم فقرے چھوٹے چھوٹے اور پیرے مختصر ہوتے ہیں تا کہ مضمون پڑھتے ہوئے قاری کی طبیعت نہ گھبرائے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض جگہ اُن کے فقرے طویل اور پیچ دار بھی ہو جاتے ہیں۔ اور عبارت مغلق، مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ سرسید اپنے مضامین میں جو کچھ بیان کرنا چاہتے ہیں اُس کو دلائل کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اُن کے مضامین کا انداز ہ اکثر نہایت خطیبانہ ہوتا ہے اور قوم کی فلاح و بہبود کے جذبات سے بھر پور ہوتے ہیں۔

اپنی قوم کی پستی، غربت اور بدحالی کو دیکھ کر سرسید کا احساس دل نہایت غمگین ہو گیا تھا اُس وقت وہ ایسے دل چسپ اور ایسے پرلطف مضمون لکھتے تھے کہ پڑھ کر بڑا مزا آتا تھا۔ مثلاً تہذیب الاخلاق میں ''امید کی خوشی'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس نہایت شگفتہ مضمون میں خصوصاً وہ لوری جو ماں اپنے بچے کو دیتی ہے۔ اردو ادب میں ایک شاہکار چیز ہے۔ بعض اوقات خود سرسید احمد خان فرضی ناموں سے مضامین لکھا کرتے تھے۔ ایسے مضامین کے آخر میں وہ (اے۔ ڈی) یا (ایس۔ ٹی) کے حروف دیا کرتے تھے۔ اس کا مقصد کسی کی تنقیص نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ یہ ہوتا تھا کہ ایک ہی نام ''سید احمد'' کو پڑھتے پڑھتے لوگ اُکتا نہ جائیں۔ سرسید احمد خان کا قاعدہ تھا کہ

اپنے مخالفین کی مخالفت کو اپنے مضامین میں ایک یا تو مذاق میں اُڑا دیتے تھے یا بے پروائی کے ساتھ ٹکرا دیتے تھے یا مخالفت پر رنج وافسوس کا اظہار کر کے خاموش ہو جاتے تھے مگر بعض اوقات غصہ بھی آ جاتا تھا اس وقت وہ بہت سختی کے ساتھ اپنے مخالفین کا اپنے مضامین میں ذکر کرتے تھے اور ان کے متعلق بہت سخت الفاظ بھی الفاظ کرتے تھے۔ سر سید احمد خان مضامین میں تعصو بیت سے قطعی کام نہیں لیتے تھے۔ اور جو بات کہنی ہوتی تھی۔ بڑی آزادی کے ساتھ صاف صاف کہہ دیتے تھے۔ چاہئے کوئی برا مانے یا بھلا اپنی صاف گوئی کے متعلق خود ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

''میرے سچے مذہب نے مجھے سیکھایا ہے سچ کہنا اور سچ کرنا۔ برا انسان وہ ہے جو کہتا کچھ اور کرنا کچھ ہو اور اس سے بھی زیادہ نہایت برا انسان وہ ہے جو شریعت کے حکم سے واقف ہو اور پھر رسم ورواج کی شرم سے یا لگوں کے ڈر سے اس کے کرنے میں تامل کرے۔''(1)

سر سید احمد خان اپنے مضامین میں اس بات کو بار بار بیان کرتے تھے کہ ترقی کرنے اور عروج حاصل کرنے کے لیے نیز خدا کی درگاہ میں مقبول ہونے کے لئے لمبے چوڑے دعوؤں تقریروں اور فصیح تحریروں کی ضرورت نہیں بلکہ ''عمل'' کی ضرورت ہوتی ہے۔ صرف عمل ہی سے دنیوی بھلائی اور دینی بہبودی حاصل ہوسکتی ہے۔ سر سید احمد خان کا قاعدہ تھا کہ مضمون لکھتے وقت ایک ہی قسم کے الفاظ کے آگے وقفہ (۔) دینے کے بجائے ہر لفظ کے آگے ''اور'' کا لفظ لکھا کرتے تھے۔ یہ فقرہ ''سویلیزیشن سے مراد ہے انسان کے تمام افعال اور اخلاق اور معاملات اور طریقہ تمدن اور صرف اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون کو اعلیٰ درجے کی عمدگی پر پہنچانا۔''

سر سید احمد خان کے مضامین میں ظرافت کا عنصر بھی خاصا ہوتا ہے تھا مگر پکڑ پن سے خالی اور بازاری الفاظ سے معرّا۔ مزاحیہ فقرے ایسے لطیف ہوتے تھے کہ مخالف کو ناگوار بھی نہ ہوں اور طنز بھی بھر پور ہو۔ ایک صاحب نے ''تہذیب الاخلاق'' کی مخالفت میں خدا سے دعا مانگی۔

عنایت کر مجھے آتش ربانی

کہ لب تک لاسکوں رازِ نہانی

بتانِ سنگ دل کا دل جلا دے

زبان کو شعلہ دوزخ بنا دے۔

اس پر سر سید احمد خان تحریر فرماتے ہیں۔ ''مولوی صاحب نے خدا سے دعا مانگی ہے کہ خدا اُن کی زبان کو شعلہ دوزخ بنا دے، مگر اُن کو ایسی دعا کرنی نہیں چاہیئے اور اپنی زبان پر رحم کرنا چاہیئے۔''

عام ادیبوں کا قاعدہ تھا کہ وہ صرف ایک یا دو قسم کے مضامین لکھ سکتے تھے۔ مگر سر سید احمد خان میں یہ وصف تھا کہ انہوں نے بہ کثرت موضوعات پر طویل مضمون لکھے ہیں۔ اور اُن میں پورے طور پر کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ سر سید احمد خان نے بہت سے انگریزی مضامین کا ترجمہ نہیں کروایا بلکہ اُن کا مطلب اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ان کا مقصد تھا کہ قوم کی اصلاح ہو اور اہل یوروپ کے عمدہ خیالات اور افکار سے اہل وطن واقفیت حاصل کریں۔ اور اُردو کا دامن گونا گوں مفید مضامین سے بھر جائے۔ علمی مضامین اُردو میں آسانی سے بیان نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اس میں ابھی اصطلاحات کی کمی تھی۔ مگر سر سید احمد خان نے ایسی سلاست کے ساتھ علمی مضامین پر قلم اٹھایا کہ الفاظ کی کمی اُن کی راہ میں حائل نہ ہوئی۔ مضمون نویسی میں متعلق سر سید احمد خان کا ایک

اصول یہ تھا کہ طرز بیان سادہ اور سلیس ہو۔ اور حقیقت پر مبنی ہو اور مضامین کی تحریر میں صفائی اور سچائی ہمیشہ مدنظر رہے۔

اکثر ایسے مضامین اور خطوط بھی سرسید احمد خان کے پاس آتے تھے جن میں بد کلامی ہوا کرتی تھی۔ مگر سرسید احمد خان نے کبھی اُن کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے ہر مضمون کو وہ نظر انداز کر دیتے تھے۔

مولانا حالی لکھتے ہیں:

> جو فضول تحریریں لوگ اُن کے پاس بھیجتے تھے۔ اُن کا جواب کچھ نہیں دیتے تھے۔ کبھی انہوں نے کسی تحریر کو اس خیال سے کہ مخالف کو الزام دینے یا شرمندہ کرنے کا موقع رہے، اپنے پاس دستاویزات بنا کر نہیں رکھا۔'' (2)

سرسید احمد خان کے کلام میں بعض متروک الفاظ بھی اکثر ملتے ہیں جن کو انہوں نے ترک کرنے کا آخر وقت خیال نہ کیا۔ مثلاً

''اپنے تئیں''	بجائے	''اپنے آپ کو''
''کر کر''	بجائے	''کر کے''
''جو کہ''	بجائے	''چونکہ''
''چھاپہ ہوئی ہے''	بجائے	''چھپی ہوئی''
''خرید کر کے''	بجائے	''خرید کر'' وغیرہ وغیرہ

سرسید احمد خان کی تحریروں میں بعض مشکل اور ادق الفاظ ہیں۔ مثلاً ''معمّم'' (بڑے بڑے عمامے باندھنے والے) مشمّل (جن کے شملے بہت بڑے بڑے ہوں) وغیرہ۔ مگر ان جزوی اور

معمولی باتوں سے سرسید احمد خان کے مضامین اور مقالات کی عظمت اور رفعت کم نہیں ہوگی۔ جہاں بہت سی خوبیاں اُن کی تحریروں میں پائی جاتی ہیں اگر دو چار نقائص بھی ان میں ہوں تو اُن کے باعث سرسید احمد خان کے کلام کا رتبہ کم نہیں ہوتا۔

مولانا حالی کیا خوب فرماتے ہیں۔

کچھ نقص انار کی لطافت میں نہیں
ہوں اُس میں اگر گلے سڑے دانے چند

سرسید احمد خان کا انداز بیان مذہبی مضامین لکھتے وقت اکثر مناظرانہ ہو جاتا تھا۔ مذہبی مقالات میں معقولات سے استفادہ سرسید احمد خان کے مضامین کی خاص صفت ہیں۔ سرسید احمد خان کے مضمون نویسی کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے قدیم موضوعات کو نئے اسلوب نگارش کے ساتھ اس طرح پیش کیا کہ وہ ایک نئی چیز معلوم ہونے لگی۔ اگر چہ وہ اعلیٰ درجے کے مضمون نگار اور بہترین مقالہ نویس تھے مگر انہوں نے کبھی ادبیت اور انشاء پردازی کا دعویٰ نہیں کیا۔ وہ ادیب اور انشاء پردازی سے زیادہ مصلح تھے۔ اسی لیئے وہ اصلاح کے جوش میں انشاء پردازوں کے مقررہ قواعد اور اہل زبان کے مجوزہ محاوروں کا قطعاً لحاظ نہیں کرتے تھے۔ جو کچھ اُن کے دل میں آتا تھا۔ بے اختیار اُن کے قلم سے الفاظ کی شکل میں نمودار ہو جاتا تھا۔

سرسید احمد خان کے مضامین اور اُن کی تحریروں کا اثر اُن کے مداحوں ، دوستوں پر زبردست پڑا۔ انہوں نے وہی طرز تحریر اختیار کی جو اُس کے قائد کی تھی۔ مثلاً شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی ، نواب محسن الملک ، نواب یار جنگ ، شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی ، خان بہادر شمس العلماء ، مولانا ذکاء اللہ اور اُن کے لائق اور قابل فرزند مولانا عنایت اللہ دہلوی ، وغیرہ۔

بالآخر یہی لوگ نثر اردو کے امام مانے گئے اور بعد کے لوگوں نے ان ہی تقلید کر کے ادب و انشاء میں نام پیدا کیا۔

فن مقالہ نگاری موجودہ حالت میں درحقیقت سرسید احمد خان کے زمانے سے قبل عام طور پر رائج نہ تھا۔سرسید احمد خان ہی نے اس کو شروع کیا، ترقی دی اور عروج پر پہنچایا۔اس لیے وہی موجودہ مقالہ نگاری کے بانی ہیں ۔غرض سرسید احمد خان کے مضامین ومقالات ایک سدابہار گلدستہ ہیں جن میں ہر رنگ اور ہر قسم کے خوشبودار پھول موجود ہیں ۔

سرسید احمد خان کے تقریری مقالات کا مقصد:

سرسید احمد خان کے تقریری مقالات کا مقصد تھا کہ مسلمان اپنی پست حالی کا علاج کریں اور علم و ہنر کا شوق ان میں پیدا ہو۔ ان کے دلوں میں پرانے اور دقیانوسی خیالات دور ہوں انگریزی قوم اور انگریزی زبان کو نفرت کی نگاہ سے نہ دیکھیں اور اسلام کو اس کی تعلیمات کو حقیقی روشنی میں دیکھیں اپنے اندر جوش ہمت حوصلہ الغرض جو خوبیاں موجود زمانہ ہم سے طلب کر رہا ہے پیدا کریں ۔شاعری گل وبلبل اور عشق و یاس کے دائرے سے نکل کر یوروپین طریقہ اختیار کرے قوم خواب سے بیدار ہو اور علمی، معاشرتی ،تہذیبی اور اخلاقی ترقی اور تہذیب کا سچا اور حقیقی احساس ان میں پیدا ہو۔ پرانے رسم ورواج کی قید سے آزاد ہوں ۔ ہندوستان اور خاص کر مسلمان مغربی سائنس سے فائدہ اٹھائیں ۔اپنی حرفتوں اور صنعتوں اور ضرورتوں میں اس کا استعمال کرنے سے خوف نہ کریں بلکہ اپنی زندگی کو تربیت وتعلیم کے اس ڈھانچے میں ڈھال لیں ۔علم وادب اور انشاء میں سادگی پیدا ہو۔ چنانچہ سرسید احمد خان نے اپنی تحریر، تقریر اور عمل کے ذریعہ وہ کام کیا جو غیر معمولی تھا یا جو اشرف المخلوقات انسان کے لئے ضروری ہے۔لیکن اس کے کرنے سے وہ بچتا ہے ۔سرسید احمد خان نے سچی قربانی اور حقیقی معنی میں جہاد شروع کیا اور انجام تک پہونچادیا۔

حواشی:

1. حیات جاوید، صفحہ:198
2. حیات جاوید، صفحہ:788

کتاب	مرتب	ناشر/مقام اشاعت	سن اشاعت
انتخاب مضامین سرسید	ایجوکیشنل بک ہاؤس	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	1976ء

مضمون: تعصب (ص:19)

اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کی بدترین خصلتوں میں سے تعصب بھی ایک بد ترین خصلت ہے۔ جو انسان کی نیکیوں اور خوبیوں کو تباہ و برباد کردیتی ہے۔ مذہب کی بنیاد پر تعصب کرنا بری بات ہے تعصب کی بناء پر تمدن و معاشرت میں ہونے والے نقصانات کو بتایا گیا ہے۔ اور سرسید احمد خان نے اپنے ملک کے بھائیوں سے تعصب جیسی بد خصلت سے نکل کر علم و فضل اور ہنر و علم کے اعلیٰ درجہ تک پہونچنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ اس مضمون میں دینی و دنیاوی زندگی میں ہونے والے تعصّبات سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہے اس کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔

مضمون: تکمیل (ص:26)

اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ کسی شخص یا کسی قوم کی کسی چیز میں کامل سمجھ لینا بہت سی خرابیوں اور نقصانوں کا باعث ہوتا ہے۔ مضمون میں اس بات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں نے اس نقص کو نہایت درجہ پر پہونچا دیا ہے۔ جس سے دینی اور دنیاوی نقصان کو انتہا نہیں رہی۔ مضمون میں اس بات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ ہندو اور مسلمان وہ قومیں ہیں جو پچھلی لکیر کو کامل سمجھ کر اسی کو کرنے رہتے ہیں جبکہ انگریز، فرنچ اور جرمن ایسی قومیں ہیں جو ہمیشہ ترقی کی کوشش میں ہے۔ اس مضمون میں سرسید احمد خان نے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہا ہے کہ عمدہ اخلاق اور

قواعد کو جو خدا نے مذہب اسلام کی بدولت دیا تھا۔ ان کو غلط طریقے سے استعمال میں لانے سے غیر قومیں اسلام کو حقارت سے دیکھتی ہے۔ مضمون کے آخر میں سرسید احمد خان اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ مسلمان اپنے اخلاق اور تہذیب و شائستگی کی درستی میں کوشش کر کے اور اپنے حال اور چال چلن کو درست اور عمدہ کر کے اسلام کی جو اصلی صورت ہے وہ دنیا کو دکھا دیں۔

مضمون: رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات (ص:31)

مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس قوم میں پرانی رسم و رواج کی پابندی ہوتی ہے یعنی ان رسموں پر نہ چلنے والے کو حقیر سمجھا جاتا ہے۔ وہاں زندگی کا منشاء معدم ہو جاتا ہے۔ مضمون میں اس بات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ لوگوں کو اپنی عقل اور فہم سے کام لینا چاہئے اور رسم و رواج کی پابندی بھی ایک معقول طور پر رکھنی چاہئے۔ یعنی جو عمدہ مفید ہے ان کو اختیار کریں جو بری ہو ان کی پابندی چھوڑ دیں۔ مضمون میں اس بات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ رسم کی پابندی ہر جگہ انسان کی ترقی کی مانع و مزاحم ہے۔ اور انسان کی تنزل حالت کا اصلی باعث ہوتی ہے۔ مضمون کے آخر میں یہ بتایا گیا ہے کہ مشرقی و ایشیاء کی قوموں میں جن میں مسلمان داخل ہے۔ رسم و رواج کی پابندی کے باعث ان کا خراب حال ہے۔

مضمون: عورتوں کے حقوق (ص:44)

اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس قدر و منزلت عورتوں کی مذہب اسلام میں کی گئی ہے اور ان کے حقوق اور ان کے اختیارات کو مردوں کے برابر کیا گیا ہے۔ اس قدر آج تک کسی تربیت یافتہ ملک میں نہیں ہے۔ اس مضمون میں اس بات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ انگلینڈ جو عورتوں کی آزادی کا بڑی حامی ہے۔ جب اس کے قانون پر جو عورتوں کے باب میں ہے نظر ڈالی جائے تو

معلوم ہوگا کہ ان لوگوں نے عورتوں کو نہایت حقیر اور بے عقل اور لاشے سمجھا ہے۔ مضمون کے آخر میں یہ بتایا گیا ہے کہ انگلستان کے قانون کا عورتوں کی نسبت جو حال ہے غالباً کوئی قانون اس سے زیادہ خراب اور مضرت رساں اور ناانصاف نہ ہوگا۔

مضمون: تعلیم و تربیت (ص:46)

اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ تعلیم و تربیت دونوں الگ شئے ہے۔ جو قوتیں خدا تعالیٰ نے انسان میں رکھی ہے ان کو تحریک دینا اور شگفتہ و شاداب کرنا انسان کی تعلیم ہے۔ اور اس کو کسی بات کا مخزن اور مجمع بنانا اس کی تربیت ہے۔ مضمون میں اس بات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ بڑے بڑے عالموں کے روحانی قویٰ بالکل نیست و نابود ہو جاتے ہیں اور صرف زبانی بک بک یا تکبر و غرور اور اپنے آپ کو بے مثل و بے نظیر اور قابل ادب سمجھنے کے اور کچھ باقی نہیں رہتا۔ زندہ ہوتے ہیں مگر دلی اور روحانی قویٰ شگفتگی کے اعتبار سے بالکل مردہ ہوتے ہیں۔ اس مضمون میں سرسید احمد خان نے یہ پیغام دیا ہے کہ ایسی تعلیم کو حاصل کرنا چاہئے جو اندرونی قویٰ کو شگفتہ و شاداب کرے اور دل کی سوتوں کو کھول کر سرجی چشمہ سے پانی باہر نکالے جس سے ہماری زندگی سرسبز و شاداب ہو۔

مضمون: کاہلی (ص:49)

اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہاتھ پاؤں سے محنت نہ کرنا کاہلی نہیں ہے۔ بلکہ دلی قویٰ کو بیکار چھوڑ دینا سب سے بڑی کاہلی ہے۔ سرسید احمد خان اس مضمون میں اپنے ہم وطنوں کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ اگر ہمارے ملک میں ہم کو اپنے قوائے دلی اور قوت عقلی کو کام میں لانے کا موقع نہیں رہا ہے۔ اس کا بھی سبب یہی ہے کہ ہم نے کاہلی اختیار کی ہے۔ یعنی اپنے دلی قوی کو بے کار

چھوڑ دیا ہے۔اس مضمون میں آخر میں یہ بتایا گیا ہے کہ کسی بھی شخص کے دل کو بے کار پڑا نہیں رہنا چاہئے۔جب تک قوم سے کاہلی یعنی دل کا بیکار پڑا رہنا نہ چھوٹے گا اس وقت تک ہم کو اپنی قوم کی بہتری کی توقع نہیں کی جا سکے گی۔

مضمون: اخلاق (ص:52)

اس مضمون میں مسٹر اڈیسن کا قول ''اعتقادیات وہ مسائل ہے جو وحی سے معلوم ہوئے ہیں۔عملیات میں ان مسائل کو داخل کیا ہے۔جن کو عقل و نیچر کے مطابق مذہب سے بھی ہدایت کی ہے۔پہلے حصے کا نام عقائد اور دوسرے حصے کا نام اخلاق رکھتے ہیں۔'' سر سید نے مسٹر ایڈیسن کے ان خیالات سے اختلاف کیا ہے اس مضمون میں سر سید نے اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ مسٹر ایڈیسن اعتقادیات اور عملیات میں جس کو اخلاق کہتے ہیں کچھ علاقہ نہیں ہے ۔ کیونکہ انسان اعتقادیات پر کتنا ہی زیادہ خیال کرے اس کے اخلاق میں کچھ تفاوت نہیں ہو سکتا اس طرح اخلاق پر کیسا ہی متوجہ ہوا سکے اعتقادیات میں کچھ نقصان نہیں آ سکتا کیونکہ یہ دونوں کام دو جدا جدا حالتوں اور دو جدا جدا شخصوں سے متعلق ہے۔اس مضمون میں سر سید احمد خان نے مسٹر اڈیسن کے اس قول سے بھی اختلاف کیا ہے کہ کوئی شخص اخلاق میں کمال حاصل نہیں کر سکتا جب تک اخلاق کو عیسائی مذہب کا سہارا نہ ہو۔اس پر سر سید احمد خان کا کہنا ہے کہ کوئی اعتقاد یا کوئی مذہب سچا ہو ہی نہیں سکتا۔جس کا نتیجہ اخلاق کی عمدگی نہ ہو۔پس اخلاق کو کسی مذہب کا کچھ سہارا نہیں ہے۔اس مضمون میں اڈیسن نے غالباً عیسائی مذہب کے اس زمانے کی طرف اشارہ کیا ہے جہاں مرد اور عورت و بچے مذہب نہ ماننے پر آگ میں جلائے جاتے تھے اور لوگ خیال کرتے تھے کہ مذہب اسلام بھی کچھ اس طرح کا ہوگا۔اس مضمون میں مسلمانِ مذہب سے روشناس کروایا گیا ہے کہ کسی قسم کا جبر یا کسی کے مذہب کو بجز چھڑانا یا مذہب کے لئے کسی کا خون بہانا مذہب اسلام کے خلاف ہے۔

مضمون: ریا (ص:59)

اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا میں ایسے لوگوں کی اکثریت زیادہ ہے جن کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ ہوتا ہے۔ یعنی جو بد ہے اس سے زیادہ اپنے کو وہ بد بتاتے ہیں۔ اور جو دینداری کی بناوٹ کرنے والے جس قدر دین دار ہوتے ہیں اس سے زیادہ اپنے آپ کو نیک جتلاتے ہیں۔ اس مضمون میں سر سید احمد خان نے اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ یہ دونوں قسم کے علاوہ تیسری قسم کے لوگ ہے جو ان دو قسموں سے علیحدہ ہے۔ وہ اپنی بناوٹ سے نہ صرف دنیا کو بلکہ اکثر خود آپ بھی دھوکے میں پڑتے ہیں۔ وہ بناوٹ خود ان سے انہیں کے دل کو چھپاتی ہے۔ یعنی نیک ہے تو اس سے زیادہ ان کو نیک جتاتی ہے۔ اس مضمون میں سر سید احمد خان نے عمدہ قاعدہ یہ بتایا ہے کہ ہمیں ہمارے دشمن کی باتوں پر غور کرنا چاہیئے کیونکہ وہ ہمارے عیبوں سے مطلع کرتا ہے۔ اس طرح ہم کو ان کاموں سے بھی ڈرنا چاہیئے۔ جو انسان کے کمزور دل کی قدرتی بناوٹ سے یا کسی اور سبب سے ہوتی ہے۔ جس میں ہمارا دنیوی فائدہ ہے۔ مضمون کے آخر میں اس بات کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ ہمارے بانی اسلام نے جب ہم کو یہ سکھایا ہے کہ خدا ہر جگہ ہر حاضر و ناظر ہے ہمارے دل کے چھپے بھیدوں کو جانتا ہے تو اس نے کسی خوبی اور خوبصورتی سے اس ریا کاری کی برائی ہم کو بتلا دی جس سے انسان دنیا کو دھوکہ دیتا ہے اور خود اپنے آپ کو ہی فریب میں ڈالتا ہے۔

مضمون: مخالفت (ص:66)

اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ دشمنی اور عداوت، حسد اور رنجش اور ناراضی کے سوا ایک اور جذبہ انسان میں ہوتا ہے جو خود اس شخص میں بری عادتیں اور رذیل اخلاق پیدا کرتا ہے۔ اور بعوض اسکے کہ وہ اپنے مخالف کو کچھ نقصان پہنچادے خود اپنا آپ نقصان کرتا ہے۔ جسے مخالفت کہا

جاتا ہے ۔اس مضمون میں اس بات کی طرف روشنی ڈالی گئی ہے کہ نیک آدمی مخالف کی رائے کو نہایت نیک دلی سے سوچتا ہے۔اور ارادہ رکھتا ہے کہ اگر اس میں کوئی اچھی بات ہوتو اس کو چن لوں اور اگر مجھ میں کوئی غلطی ہوتو اس کو صحیح کرلوں۔اور اگر اپنے مخالف کی غلطیوں کی اصلاح کے درپے ہوتا ہے تو ان غلطیوں کو ایک دل سوز دوست کی طرح بتاتا ہے جبکہ نامہذب ناشائستہ آدمی یہ رستہ نہیں اپناتا بلکہ اپنے مخالف کے عیوب ذاتی سے بحث کرنے لگتا ہے۔ بلکہ ہر قسم کے بہتان باندھتا ہے۔لیکن وہ جھوٹا بدگو خود اسی گڑھے میں گرتا ہے جو اس نے اپنے مخالف کے لیے کھودا تھا۔ مضمون کے آخر میں اس بات کی نصیحت کی گئی ہے کہ انسان کو چاہئے کہ اپنے مخالف سے بھی مخالفت کرنے میں سچائی اور راست بازی، نیکی اور نیک دلی کو کام میں لانا چاہئے۔ کیونکہ یہی طریقہ اپنے مخالف پر فتح پانے کا ہے۔ ورنہ بعوض اپنے مخالف کے خود اپنے تئیں آپ رسوا کرنا ہے۔

مضمون:خوشامد(ص:70)

اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب خوشامد کے اچھا لگنے کی بیماری انسان کو لگ جاتی ہے تو اس کے دل میں ایک ایسا مادہ پیدا ہوتا ہے جو ہمیشہ زہریلی باتوں کے زہر کو چوس لینے کی خواہش رکھتا ہے۔اول یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی آپ خوشامد کرتے ہیں۔اور اپنی ہر چیز کو اچھا سمجھتے ہیں پھر رفتہ رفتہ اوروں کی خوشامد ہم میں اثر کرنے لگتی ہے ۔ پہلے ہم خود سے محبت کرنے لگتے ہیں پھر خوشامدیوں سے کرنے لگتے ہیں۔ کیونکہ ہماری محبت ہم کو یہ بتلاتی ہے کہ ان خوشامدیوں پر مہربانی کرنا نہایت حق اور انصاف ہے۔ ہماری عقل خوشامدیوں کے مکروفریب سے اندھی ہو جاتی ہے۔ اور وہ مکروفریب ہماری طبیعت پر غالب آجاتا ہے۔مضمون میں اس بات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ جب ہم میں کسی ایسے وصف کا شوق پیدا ہو جائے جو ہم میں نہیں ہے ایسا ہے جیسے کہ دوسروں

کے کپڑے جو ہمارے بدن پر کسی طرح ٹھیک نہیں ہوتے۔مضمون میں اس بات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ خودی جو انسان کو برباد کرنی والی چیز ہے جب چپ چاپ سوئی ہوئی ہوتی ہے تو خوشامد اس کو جگاتی اور ابھارتی ہے اور جس کی خوشامد کی جاتی ہے اس میں چھچھورے پن کی کافی لیاقت پیدا کر دیتی ہے۔مضمون کے آخر میں یہ بات کہی گئی ہے کہ جس طرح خوشامد ایک بدتر چیز ہے اسی طرح مناسب اور سچی تعریف کرنا نہایت عمدہ اور بہت ہی خوب چیز ہے۔

مضمون: گذرا ہوا زمانہ (ص:74)

اس مضمون میں ایک بچے کے خواب کے ذریعہ انسانی کی زندگی کے مختلف ادوار کو بتایا گیا ہے۔ کہ برس کی اخیر رات ایک بوڑھا کس طرح اپنے گزرے ہوئے زمانے کو یاد کر کے پچھتا تا ہے۔اور وقت کے گزر جانے کا افسوس کرتا ہے۔ پہلے لڑکپن کا دور جس میں کسی چیز کا غم اور کسی بات کی فکر دل میں نہ تھی۔ دوسرا جوانی کا زمانہ جس میں امنگ میں بھرا ہوا دل جذبات انسانی کے جوش کی خوشی اسے یاد آتی ہے۔تو اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھائے ہوئے زمانے میں والدین جو نصیحت کرتے تھے اور نیکی اور خدا پرستی کی بات بتاتے تھے اور یہ کہتا تھا کہ آہ ابھی بہت وقت ہے۔ بڑھاپا آنے کا کبھی خیال نہ کرتا تھا۔اس مضمون میں اس بات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ کس طرح انسان والدین، بھائی، بہن، دوست، آشنا کے ساتھ بے پروائی کج خلقی اور بے مروتی برتتا ہیں۔ لڑکپن اور جوانی کے بعد ادھیڑ پن یاد کرتا ہے جس میں روزہ، نمازیں، حج، زکوٰۃ، مسجدیں، کنویں بنوانا، کھانا کھلانا، فقیروں اور درویشوں کی خدمت کی تھی۔ افسوس کرتا ہے کہ میں نے تمام فانی چیزوں پر دل لگایا۔آخر میں اس بوڑھے کو ایک دلہن نظر آتی ہے جو کہ نیک ہوتی ہے جو بتاتی ہے کہ اخیر تک انسان ہی باقی رہے گا۔اور جو بھلائی انسان کی بہتری کے لئے کی جاتی ہے وہی نسل در نسل اخیر تک چلی آتی ہے۔مضمون کے آخر میں سر سید احمد خان یہ پیغام دیتے ہیں کہ اے میرے

پیارے نو جوانو، اپنی قوم کی بھلائی پر کوشش کرو تا کہ اخیر وقت اس بوڑھے کی طرح نہ پچھاؤ۔اور دعا کرتے ہیں کہ کوئی نو جوان اٹھے اور اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے۔آمین

مضمون: بحث وتکرار (ص:80)

اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس طرح کتّے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں ۔اور پھر لڑنا شروع کرتے ہیں ۔اسی طرح نا مہذب آدمیوں کی مجلس میں آپس میں اسی طرح تکرار ہوتی ہے۔ اس مضمون میں اس بات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ انسانون میں اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے اور اس کو پرکھنے کے لیے بحث ومباحثہ ہی کسوٹی ہوتی ہے۔مگر ہمیشہ مباحثہ اور تکرار میں تہذیب اور شائستگی، محبت اور دوستی کو ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہیۓ۔مضمون کے آخر میں سر سید احمد خان اپنے ہم وطنوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ جب تم کسی کے برخلاف کوئی بات کہنی چاہو یا کسی کی بات کی تردید کا ارادہ کرو تو خوش اخلاق اور تہذیب کو ہاتھ سے جانے مت دو بلکہ آپس میں ہنسی خوشی اور مذاق کی باتوں سے دل کو ٹھنڈا کرلو۔ کیونکہ تم اس بات سے باخوبی واقف ہو کہ مجلسوں میں آپس میں بحث وتکرار کا انجام کیا ہوتا ہے۔

مضمون: اُمید کی خوشی (ص:84)

مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح سے انسان دشوار کن حالات میں ’’اُمید‘‘ کی توقع کرتا ہے۔امید ہی کی بدولت دور دراز خوشیاں انسان کو نہایت ہی پاس نظر آتی ہے۔’’اُمید‘ ہی مصیبت کے وقت تسلی دیتی ہے۔امید کے ذریعہ ہی انسان زندگی کی مشکل سے مشکل حالات کا سامنا کرتا ہے اس مضمون میں اس بات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ کس طرح سے والدین کو اولاد سے امیدیں وابستہ ہوتی ہے۔اس مضمون میں اس بات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ کس طرح

یعقوب علیہ السلام ، یوسف علیہ السلام کے آنے کی اُمید لگائے بیٹھے تھے اور یوسف علیہ السلام اپنے ضعیف والد اور بھائیوں سے ملنے کی امید دل میں موجود تھی ۔مضمون کے آخر میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح انسان آخری وقت میں بھی امید لیئے یہ سوچتا ہے کہ دوسری دنیا جس میں ہم کو ہمیشہ رہنا ہے۔ جہاں سورج کی اور زمانہ کی لہر بھی نہیں پہنچتی۔ تیری راہ تین چیزوں سے طئے ہوتی ہے۔ ایمان کا توشہ اور امید کے ہادی اور موت کی سواری سے۔مگر ان سب چیزوں کو سب سے زیادہ قوت ہے وہ ایمان کی خوبصورتی بیٹی ہے۔جس کا پیارا نام ''اُمید'' ہے۔آخر میں سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ لوگ کہتے ہیں کہ بے یقینوں کو موت کی کٹھن گھڑی میں کچھ اُمید نہیں ہوتی مگر میں دیکھتا ہوں کہ وہاں بھی ایک امید یہ ہوتی ہے کہ تمام زندگی کی تکلیفوں کا اب خاتمہ ہے۔اب کوئی تکلیف ہونے کی توقع نہیں ہے۔ بیشک اُمید پر دنیا قائم ہے۔ بیشک اُمید پر دنیا قائم ہے۔

مضمون: سولزیشن یا تہذیب (ص:93)

اس مضمون میں بتایا گیا ہے کہ انسان میں فطری بات ہوتی ہے کہ وہ اپنے خیال کے موافق کسی چیز کو پسند اور ناپسند کرتا ہے اور اس کی طبیعت اس طرح مائل ہوتی ہے کہ اس بری چیز کی حالت کو کچھ اسطرح سے تبدیل کرلے جس کو وہ اچھا سمجھتا ہے۔یہی چیز ،سولزیشن کی جڑ ہے۔ جو کہ ہر انسان اور گروہ میں پائی جاتی ہے۔اسی تبادلہ کا نام ''سولزیشن یا تہذیب'' ہے۔اس مضمون میں اس بات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ اچھا اور برا کہنے سے قوموں کی سولزیشن میں اختلاف پڑ جاتا ہے کیونکہ ایک قوم جس بات کو اچھا سمجھتی ہے اور داخل تہذیب جانتی ہے۔ دوسری قوم اسی بات کو بہت برا اور وحشیانہ حرکت قرار دیتی ہے۔مضمون میں اس بات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ انسان کے افعال ارادی، جذبات نفسانی کو اعتدال پر رکھنا، وقت کو عزیز سمجھنا، واقعات کے اسباب کو دھونڈنا اور ایک سلسلہ میں لانا، اخلاق معاملات، معاشرت، طریقِ تمدن اور علم وفنون کو بقدر امکان

قدرتی خوبی اورفطری عمدگی پر پہونچانا اوران سب کوخوش اسلوبی سے برتنا ہی سولزیشن یا تہذیب ہے۔ مضمون کے آخر میں سر سید احمد خان نے مسٹر ایچ ، ٹی بکل صاحب کے چوتھے اصول کہ گورنمنٹ ہمیں بتادیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ سے اختلاف کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اسی خیال نے برباد کیا ہے۔ مسلمانوں میں جب تک یہ خیال نہ آئے گا کہ ہم کو اپنے لیئے کیا کرنا چاہئے۔ اس وقت تک ہندوستان کے مسلمانوں کے پاس نہ دولت ہوگی، نہ قسمت، نہ عزت ہوگی نہ منزلت اور نہ تہذیب ہوگی نہ شائستگی۔

مذہب اسلام کبھی خارج ترقی انسان نہیں ہوسکتا کیوں کہ اس مذہب کے احکام اور تہذیب وشائستگی کے کام دونوں متحد ہوتے ہیں۔

مضمون: اپنی مدد آپ (خدا ان کی مدد کرتا ہے جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں)، (ص:101)

اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ کسی شخص یا گروہ کے لئے کوئی دوسرا کچھ کرتا ہے تو اس شخص یا گروہ میں سے وہ جوش اپنے آپ مدد کرنے کا کم ہوجاتا ہے اور ضرورت اپنی مدد آپ کرنی کے اس کے دل سے مٹتی جاتی ہے۔ اس مضمون میں اس بات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ کسی ملک کی خوبی وعمدگی اور قدر ومنزلت بہ نسبت وہاں کی گورنمنٹ کے عمدہ ہونے کے زیادہ تر اس ملک کی رعایا کی چال چلن۔ اخلاق وعادات تہذیب وشائستگی پر منحصر ہے۔ کیونکہ قوم شخصی حالتوں کا مجموعہ ہے۔ اس مضمون میں جان اسٹیورڈمل کے قول سے زیادہ اتفاق کرتے ہوئے سر سید کہتے ہیں کہ جہاں شخصی اصلاح وشخصی ترقی مٹ گئی ہے وہاں کیسی ہی آزاد اور عمدہ حکومت کیوں نہ قائم کی جائے وہ کچھ بھی عمدہ نتیجے پیدا نہیں کرسکتی۔ اس مقولے کی تصدیق کو ہندوستان کی خاص ہندوستان کے مسلمانوں کے حالت کی مثال پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عمدہ گورنمنٹ سے تم نے کوئی فائدہ

نہیں اٹھایا اور تمہاری آزادی کے محفوظ رکھنے کا تم کو کیا نتیجہ حاصل ہوا۔ اس کا سبب یہی ہے کہ تم میں اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ نہیں ہے۔ اس مضمون میں اس بات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ انسان کی اگلی پشتوں کے حالات پر نظر کریں تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ موجودہ حالت انسانوں کے نسل درنسل کے کاموں سے حاصل ہوتی ہے۔ مضمون میں سرسید احمد خان یہ کہتے ہیں کہ آگے کی ترقی کے لیئے پرکھوں کی چھوڑی گئی جائیداد کو بھی ہماری قوم سنبھال نہیں پائی اور انگریزوں کی ترقی کا سبب یہی ہے کہ ہمیشہ ان کی قوم میں اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ رہا ہے۔ مضمون کے آخر میں یہ بتایا گیا ہے کہ مکتب کا علم کسی طاق یا صندوق، الماری میں رکھا ہوتا ہے جبکہ زندگی کے برتاؤ کا علم دوست، گھر کے رہنے سہنے، گلیوں مختلف جگہوں سے حاصل ہوتا ہے۔ ایک شخص میں اپنی آپ مدد کرنے کا جذبہ اس کی سچی ترقی کی بنیاد ہوتا ہے۔

مضمون: سمجھ (یعنی تمیز سے بھلائی براء میں امتیاز کیا جاتا ہے)، (ص: 112)

اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ دانا شخص سوچ سمجھ کر گفتگو کرتا ہے۔ جبکہ نادان شخص بنا سوچے سمجھے گفتگو کرتا ہے۔ اس مضمون میں اس بات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ کہ سمجھ صرف باتوں پر ہی منحصر نہیں ہوتی بلکہ ہر قسم کے کاموں سے بھی متعلق ہوتی ہے۔ سمجھ بغیر علم اور عقل دونوں کے ناچیز ہے۔ اس شخص کی گفتگو ہمیشہ غالب رہتی ہے جس کے پاس سمجھ ہو۔ مضمون میں اس بات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ سمجھ جس طرح کہ انسان کے لیے بہت بڑا کمال ہے اُس طرح مکر اس کے حق میں بہت بڑا وبال ہے۔ سمجھ نہایت عمدہ اور نیک مقصد پیدا کرتی ہے جبکہ مکر میں صرف خود غرضی ہوتی ہے۔ سمجھ والے آدمی کی طبیعت ہمیشہ زمانہ حال اور مستقبل دونوں پر لگی رہتی ہے۔ مضمون کے آخر میں سرسید احمد خان کہتے ہیں کہ یہاں سمجھ کو میں نے ایک نیکی اور کمال کے طور پر بیان کیا ہے۔ وہ صرف دنیا کے کاموں کے لئے مفید نہیں ہے۔ بلکہ ہماری ہمیشہ رہنے والی زندگی

کے لئے بھی فائدہ مند ہے۔ مصنف کے اس قول پر کہ سمجھ ایسے لوگوں کو خود تلاش کرتی ہے جو اس کے لائق ہے۔ پھر کبھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہماری قوم میں سب کچھ ہے۔ پر یہی نہیں۔

مضمون: اختتام سال 1291ھ سے شروع سال 1292ھ، (ص:118)

اس مضمون میں سر سید احمد نے قوم کو جگانے کی جو کوششیں کی ہے اُن کا ذکر کیا گیا ہے۔ سر سید احمد خان نے پہلا پرچہ یکم شوال 1280ھ نبوی اور 1287 ہجری کو نکالا تھا۔ اس مضمون میں سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ ہماری قوم کچھ نہ تھی اور جانتے تھے کہ ہم سب کچھ ہیں۔ اس غفلت کی داروئے بے ہوشی نے ان کے کانوں کو بہرا، آنکھوں کو پتھرا دیا تھا۔ دل پتھر کے اور دماغ بے قابو ہو گئے تھے۔ زندہ سے مردوں سے برتر۔ لیکن کچھ عرصے میں وہ حالت بہت کچھ بدل گئی۔ کچھ لوگ ہوشیار ہو گئے وہ سمجھ گئے کہ ہماری کیا حالت ہے اور ہم پر کیا مصیبت ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں سید احمد کون ہے۔ جو جگاتا پھرتا ہے۔ اس بات کو سن کر میں کہتا ہوں خدا نے چاہا تو سمجھدار بھی ہو جائینگے۔ اس مضمون میں سر سید احمد خان نے اس بات کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ یہ ولولہ اور غلغلہ ہر ایک بات کا چرچا دراصل ہماری قوم کی بھلائی کی نشانی ہے۔ کیونکہ جو بات ٹھیک نہیں ہو آج نہیں کل سب کو معلوم ہو جائیگی۔ اور سب ایسی پر متفق ہونگے اور قوم کہے گی سید بھی کوئی دیوانہ تھا ہر بات ٹھکانے کی کہتا تھا۔ سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ اگر میرا خیال صحیح ہوا اور قوم میں تحریک آ گئی ہو تو ہمارے اس ناچیز پرچے نے اپنا کام پورا کر لیا۔ مضمون کے آخر میں سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ ہمارے بعض محبّ وطن جو قوم کی بھلائی و ترقی چاہتے ہیں۔ کبھی غلطی میں پڑ جاتے ہیں۔ اصلی سچی، خیر خواہی قوم کی یہی ہوتی ہے کہ اس کے نقصانوں اور عیبوں سے مطلع کریں۔ اور ان کو مٹانے کی فکر کریں۔ درحقیقت میں وہی لوگ اصل میں محبّ وطن قوم ہوتے ہیں۔

مضمون: آخری پرچہ تہذیب الاخلاق، (ص:123)

اس مضمون آخری پرچہ تہذیب الاخلاق میں سرسید احمد خان کہتے ہیں کہ میری تحریروں سے قوم میں کچھ بدلاؤ آجائے یا حرکت ہوجائے تو میری کوششیں کامیاب ہوجائے گی۔مضمون میں سرسید احمد خان اس بات کا تذکرہ کرتے ہیں کہ قومی بھلائی کے لیے پرچہ تہذیب الاخلاق نکالا گیا تھا۔جس کا مقصد نہ صرف قوم کو اس کی دینی و دنیاوی ابتر حالت کا جتلانا اور سوتوں کو جگانا تھا بلکہ سوتی قوم کو کو اٹھانا اور بند سڑے ہوئے پانی میں تحریک پیدا کرنا تھا۔یقین تھا کہ سڑے ہوئے پانی کو ہلانے سے بد بو پھیلے گی مگر حرکت آجانے سے پھر خوشگوار ہوجانے کی توقع ہوتی تھی۔مضمون میں سرسید احمد خان نے اس بات کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ سات برس تک اس پرچہ کے ذریعہ قوم کی خدمت کی مذہبی بیجا جوش سے جس تاریک گڑھے میں وہ چلی جاتی تھی اس سے خبردار کیا۔دنیاوی باتوں میں جن تاریک خیالات کے اندھیرے میں وہ مبتلا تھی اس میں ان کو روشنی دکھلائی۔مذہب اسلام پر نادانی کی جس قدر گھٹائیں چھارہی تھیں ان کو ہٹایا اور اس کے اصلی نور کو جہاں تک ہوسکے چمکایا۔سرسید احمد خان کہتے ہیں کہ قومی ہمدردی، قومی عزت، اپنے آپ عزت کا خیال اگر ہم نے اپنی قوم میں پیدا نہیں کیا تو ان لفظوں کو تو ضرور اور اُردو زبان کے علم و ادب میں داخل کیا۔علم و ادب کی ترقی سے ہماری مراد تھی جس کو ہم نے بھر پایا۔اس مضمون کے آخر میں سرسید احمد خان کہتے ہیں کہ ہماری خاموشی کو غلط خیال نہ کرے بلکہ یہ خیال کرے کہ ہم کسی دوسری قومی بھلائی کے کام میں مصروف ہونگے جو اس سے بھی زیادہ قوم کو مفید ہوگا۔اور پرچہ کے بند ہوجانے پر ہم تمام دوست سے معذرت کرتے ہیں۔

☆☆☆

کتاب	مصنف/مرتب	حصہ اول	ناشر/مقام اشاعت	سن اشاعت
اُردو کا کلاسیکی ادب مقالات سرسید	مولانا محمد اسماعیل پانی پتی	مذہبی و اسلامی مضامین	مجلس ترقی ادب نرسنگ داس گارڈن کلب روڈ لاہور	ندارد

مضمون: مناجات سرسید بارگاہ رب العزت (ص:1)

(منقول از حیات جاوید حصہ اول صفحہ:150)

اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ 1857ء کے قیامت خیز اور خونی ہنگامہ کے بعد جب ملک میں امن قائم ہوا اور ملکہ وکٹوریہ نے عام معافی کا اعلان کر دیا۔ اس وقت سرسید مراد آباد (U.P) میں صدر الصدور تھے۔ انکی تحریک پر شہر کے مسلمانوں کا ایک عظیم مجمع اظہار شکر کے لیے حضرت شاہ بلاقی کی درگاہ میں 28/جولائی 1859ء کو جمع ہوا۔ تقریر سے پہلے سرسید احمد خان نے لکھی مناجات کو بلند آواز میں پڑھا تھا۔ اس مضمون میں اس مناجات کے متعلق مولانا حالی، حیات جاوید میں جس باتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ نہ شاندار الفاظ ہے نہ بیان کی رنگینی بلکہ سیدھے سادھے فقرے اور بے ساختہ جملے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تباہی اور بربادی نے سرسید احمد خان کے دل میں عجیب بے چینی کی کیفیت کر رکھی تھی۔ اس مضمون میں بیان کی گئی دعا کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف سے اس درد اور تڑپ کا نہایت زور اور شدت سے اظہار ہوتا ہے۔ جو سرسید احمد خان کے دل میں اپنی قوم کا تھا۔ لیکن افسوس اس تمام ہمدردی، غم خواری اور درد و کرب کا صلہ قوم کی طرف سے سوائے کفر اور فتوؤں کے سرسید احمد خان کو اور کچھ نہ ملا۔

پر درد اور عاجزانہ دعا (ص:5)

(تہذیب الاخلاق بابت 10 محرم 1289ھ)

اس مضمون میں اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ سر سید کے دل میں اسلام کا کتنا درد تھا۔ اور وہ مسلمانوں کے کس قدر ہمدرد تھے۔ اور کس درد اور تڑپ کے ساتھ خداوند کریم کے حضور عاجزانہ طور پر دعائیں مانگتے تھے۔ اس مضمون میں موجود دعا سر سید نے 27 ؍فروری 1872ء کو ایک عام جلسہ میں پڑھی تھی۔

مضمون: طبقات علوم الدین (ص:36)

سر سید اپنے اس مضمون میں مسلمانان زمانہ کا ذکر کر رہے ہیں جنہیں علوم دین کے طبقات سے واقفیت نہیں ہے۔ اور طبقات علوم کو بیان کرنے کے لئے انہوں نے شاہ ولی اللہؒ کی کتاب کا حوالہ دیا ہے۔

جسکے مطابق طبقہ اول میں حدیثوں کے پہنچاننے کا علم کہ کون سی صحیح ہے اور کون سی ضعیف کونسی معتبر ہے کون سی نامعتبر ہے۔

طبقہ دوم میں کلام الٰہی اور ان حدیثوں کے معنیٰ بیان کرنے کا علم شامل ہے۔

طبقہ سوم کلام الٰہی اور حدیثوں کے معنوں کو بطور اصطلاحات شرعیہ قرار دینے اور ان سے احکام کے شرعیہ کے نکالنے کا کام شامل ہے۔

طبقہ چہارم مذہب اسلام کے اسرار جاننے کا علم شامل کیا گیا ہے۔

سر سید احمد خان نے اپنی کتاب میں جس کتاب کا حوالہ دیا ہے اُسکے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا

ہے کہ علم سے آدمی پکا مسلمان ہوتا ہے۔موجودہ زمانہ میں چاروں طرف علوم کی ترقی بہت زیادہ ہوگئی اور اسکی شعاعیں تمام دنیا میں پھیل گئی ہیں اور آئندہ بھی پھیلتی رہیں گی۔مصنف کہتے ہیں کہ بعض ملکوں میں عام عوام اور خاص خواص سب کے خیالات کو وسعت نہ ہوئی ہو مگر عام خیالات کو وسعت ہوگئی ہے۔

سر سید احمد خان مزید لکھتے ہیں کہ حال کے زمانہ کے لوگوں کے خیالات کو بہ نسبت اس زمانے کے بہت زیادہ وسعت ملی ہے۔

اس مضمون سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کوئی بھی علم یا اسکا بیان ایسا عام ہونا چاہئے جو معتقدین اور غیر معتقدین سب کے لئے موثر اور مفید ہو۔

مضمون: احادیث (ص:41)

سر سید احمد خان اپنے اس مضمون میں کہتے ہیں کہ صحابہ اکرام بنی اقدس کی تمام حدیثوں کی روایت کو ناپسند کرتے تھے کیونکہ لوگ جو بھی بیان کرتے اس میں شبہ تھا کہ وہ صحیح بیان کرے گا یا نہیں، مگر احادیثوں کا بیان کرنا روکا بھی نہیں جاسکتا تھا اور لوگ دنیا و دین کے معاملوں میں حضورﷺ کا فرمان دریافت کرنا چاہتے تھے اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے حدیثوں کو جمع کرنے کی کوششیں کی گئی اور ان حدیثوں کا ادب کرنا ہم پر لازم ہے مگر حدیثوں کے جمع ہونے اور الفاظوں کے استعمال سے متعلق بھی ہمیں جاننے کی ضرورت ہے۔

سر سید احمد خان کے مطابق حدیث کو ہم بلفظ اور بالمعنی روایت کرنا درست ہے یا نہیں اس میں بھی محدثیں کے درمیان اختلاف پائے جانے کا پتہ چلتا ہے۔کچھ محدثیں بالمعنی حدیث بیان کرنے کو درست فرماتے ہیں اور کچھ بلفظ حدیث کے بیان کو درست سمجھتے ہیں۔

محدثین کے ان اختلاف کے بعد کچھ بزرگوں نے صرف صحابہ اور تابعین کو بالمعنیٰ روایت کرنی جائز قرار دی ہے دیگر کو نہیں۔

مضمون: کتب احادیث (ص:60)

سرسید احمد خان نے اس مضمون میں احادیث کتب کے انتخاب پر روشنی ڈالی ہے اور کتب احادیث کی تفصیل جو اقسام میں بیان کی ہے جن میں صحت، شہرت قبول شامل ہے۔

حدیث کی 3 کتابیں صحیح بخاری، صحیح مسلم اور موطا امام مالک اول درجہ کی کتابیں ہیں اور جامع ترمذی سنن ابو داؤد اور سنن سنائی دوسرے درجہ میں شامل کی گئی ہیں۔ شاہ ولی اللہ نے ان احادیث کے کتابوں کی درجہ بندی کی ہے۔

سرسید احمد خان نے اس مضمون میں حدیثوں کے پہچاننے کی صورتوں سے بھی واقف کر وایا ہے۔ اور مذہبی توہمات سے اجتناب کرنے پر زور دیا ہے اور بے سند حدیث، یا ضعیف حدیث یا مشتبہ حدیث کو حدیث نہیں سمجھنا چاہئے اور مذہبی باتوں میں اسے داخل نہیں کرنا چاہئے۔

مضمون: اقسام احادیث (ص:65)

سرسید احمد خان اس مضمون میں لکھتے ہیں کہ ایسے مسائل جو کہ غلط یا نا معتبر حدیثوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ اور لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تحقیق حدیث کا زمانہ گزر گیا اور پچھلے علماء نے جو تحقیق کی ہے وہی محققہ ہیں۔ حدیث کے تحقیق سے مراد کوئی نئ تحقیق نہیں ہے بلکہ قول، فعل یا تقریر رسول خدا کی ہے وہ مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ اسی مقصد سے سرسید احمد خان نے اقسام حدیث سے واقف کروایا ہے۔ اور حدیثوں کا آپس میں تقابل بھی کیا گیا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ حدیث کی روایت بلفظ نہیں ہوتی بلکہ بالمعنی ہوتی تھی۔

مصنف نے احادیث کی 12 اقسام بیان کی ہیں اور لکھتے ہیں کہ حدیثوں کو حدیث نبوی ٹھہرانے کے لئے اصول پر عمل پیرا ہونا چاہئے اور مکمل طور پر 7 اصولوں سے انکی جانچ کرتے ہوئے احادیث کو حدیث نبوی میں شمار کیا جانا چاہئے۔

مضمون: احادیث غیر معتمد (ص:78)

سر سید احمد خان نے اس مضمون میں حدیثوں کی تنقیح پر اپنے خیالات بیان کئے ہیں اور لکھا ہے کہ حدیث کی تنقیح نہ کرنا بے ادبی اور اسلام سے دشمنی کو ظاہر کرتا ہے۔ اور غیر کے کلام سے اپنے رسول ﷺ کے کلام کو علیحدہ کرنا سچی محبت اور ادب ہے۔ اس مضمون کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ کچھ احادیث ایسی بھی ہیں جنہیں علما نے قابل اعتماد نہیں سمجھا ہے اور ان حدیثوں کو جو معتبر نہیں ہیں نہ ماننا دین داری ہے۔ اور اس مضمون میں 46 ایسی حدیثیں بیان کی گئی ہیں جو کہ صحیح حدیث نہیں ہے اور اگر کوئی بھی حدیث ہمارے سامنے آتی ہے تو ہمیں چاہئے کہ ہم اسکی بخوبی جانچ کرے اور ایسا کرنے سے اسلام میں کوئی رکاوٹ نہیں آتی ہے۔ مصنف نے کتاب صحیح بخاری میں موجود احادیث کی تنقیح کرنے کے لئے کہا ہے۔ جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ صحیح حدیث کافی اہمیت رکھتی ہے۔

مضمون: قصص احادیث وتفسیر (ص:84)

سر سید احمد خان اپنے اس مضمون میں لکھتے ہے کہ تفاسیر کے قصوں اور تفسیروں کو حدیثیں لائق اعتماد نہیں ہوتی اور اسی سبب وہ لغو سمجھی جاتی ہے اور جب تک ہم اس کی تنقیح نہیں کرتے اعتماد نہیں کر سکتے۔

وہ لکھتے ہیں کہ مقصد مقدسین ومتبحرین کے دو گروہ میں زمین آسمان اور پیغمبر اسلام کے

اعتقاد پر جھگڑا ہوا اور بات فتویٰ تک جا پہونچی۔ اور مفتی نے جو فتویٰ جاری کیا وہ قصص تفسیروں اور احادیث پر مشتمل تھا۔ اور اسکا مطالعہ کرنے سے یہ واضح ہوا کہ بہت سے اکابر مکہ معظّمہ قصص و احادیث کو لغو و نا معتبر سمجھتے تھے اور اس فتویٰ کے جاری ہونے کے بعد احادیث اور قصص کی تفسیر پر اعتماد کے لئے عقل و حافظہ کا درست ہونا اور حدیث کا معتبر ہونا لازمی قرار دیا گیا۔

مضمون: تشبہ (ص:90)

سر سید احمد خان نے اپنے مضمون میں کتاب اقوام المسالک کی تقریر پر روشنی ڈالی ہے جس میں انہوں نے بڑے بڑے علما کی تقریظیں چھاپی ہیں اور اس تقریر کو شائع کرنے کا مقصد سر سید احمد خان کچھ یوں بیان کرتے ہیں کہ غافل لوگوں کو ہوشیار کرنے اور متنبہ کرنے کی ضرورت ہے جو کہ اچھی بات کو صرف اسی لئے اختیار نہیں کرتے کہ وہ انکی شریعت میں نہیں ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ وہ دوسرے مذہب کے لوگوں کی باتوں کو ترک کرنے کے قابل سمجھتے ہیں چاہے وہ بات کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو۔ اور انکا ایسا کرنا سراسر غلط ہے اور یہ بات بھی سچ ہے کہ ہر اہل مذہب دوسرے مذہب کو غلط قرار دیتا ہے جبکہ غیر مذہب والے کی دنیوی باتیں بھی بری سمجھی جاتی ہے۔ اور ہمیں ایسا کرنے کے بجائے ان باتوں پر عمل کرنے کی اور اپنی زندگیوں میں انہیں شامل کرنے کی ضرورت ہے۔

مصنف لکھتے ہیں کہ اصل دانش مند وہی ہے جو کسی بات کے سامنے آنے پر یا اس کے ساتھ پیش آنے پر اسکی جانچ کرے اور اُسے اچھا سمجھے۔ اور اس بات کو ضرور یاد رکھیں کہ شرعیہ کے خلاف جو باتیں ہیں وہی ممنوع ہیں۔

سر سید احمد خان نے ملک کی اور قوم کی ترقی کے لئے مشاہدے اور تصدیق کی اہمیت کو بھی اپنے مضمون میں واضح کیا ہے۔

مضمون: بحث ناسخ ومنسوخ (ص:100)

اس مضمون میں سر سید نے قرآنی آیات بیان کی ہے جسکے ترجمہ سے یہ ثابت ہوتا کہ قرآن مجید میں ناسخ ومنسوخ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

سورۃ الرعد کی آیت و دیگر آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جن احکام کو خدا چاہتا ہے اُسے قائم رکھتا ہے اور جن احکام کو چاہتا ہے اٹھا دیتا ہے۔ اور ان آیتوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قرآن مجید کی ایک آیت دوسری آیت سے منسوخ نہیں ہوتی ہے۔

مصنف کا کہنا ہے کہ قرآن مجید میں ناسخ ومنسوخ ہونے کا فقہا نے جو دعویٰ پیش کیا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیتیں شرائع سابقہ انبیاء کے بعض احکام کے تبدیل ہونے سے تعلق رکھتی ہیں نہ کہ قرآن مجید کی آیتوں کے باہم ناسخ ومنسوخ ہونے کی۔

مضمون: مکاشفہ (ص:110)

کشف اور مکاشفہ سے سر سید احمد خان نے ہمیں اس مضمون میں واقف کروایا ہے۔ حضرات صوفیہ اکرام نے روح اور جسم کے حجاب کو اٹھ جانے کو مکاشفہ کہا ہے جو کہ پردہ، یا کپڑا نہیں ہے۔ اور تفسیر کے ذریعہ یہ پتہ چلا ہے کہ قرآن میں استعمال کیا گیا ہے لفظ غطاء کے معنیٰ غفلت کا نہ ہونا پردہ اٹھ جانا ہے۔ سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ مشاغل دنیا سے علیحدہ ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہونا غفلت ختم ہو جانا کہلاتا ہے۔ اور اسی صورت کو مکاشفہ اور خیال انسانی کو مکاشفہ نوری کہا گیا ہے اور دیگر اقسام کو بھی سر سید احمد خان نے مثالوں کے ذریعہ بیان کر دیا ہے۔

سر سید احمد خان نے اپنے مضمون میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ مکاشفہ حقیقی چیز نہیں بلکہ بزرگ اور مذہبی آدمیوں کے دل میں آنے والا خیال ہے۔

مضمون: واقعات عامۃ الودود (ص:114)

سر سید احمد خان نے اس مضمون میں دنیا کے دو قسم کے لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ جن میں اہل اللہ اور اہل دنیا شامل ہیں۔ اہل اللہ وہ لوگ ہیں جو کسی بھی واقعہ کو کرشمہ رب سمجھتے ہیں جبکہ اہل دنیا اتفاقی واقعات سمجھ کر کچھ خیال نہیں کرتے۔ شاہ ولی اللہ کے دو واقعات کا سر سید احمد کان نے اس مضمون میں ذکر کیا ہے اور کہتے ہیں کہ اولیائے اللہ کی بے پروائی پر وہ اُسے خدا کی طرف سے مواخذہ کرتے اور افسوس کیا کرتے تھے اور اللہ سے معافی طلب کرتے جبکہ اہل دنیا کا کوئی بھی شخص کسی واقعہ پر رنج وافسوس کرتا ہے مگر خدا کے مواخذوں سے تعبیر نہیں کرتا ہے۔ اہل اللہ کا کسی بات کو اللہ کی طرف منسوب کرنا اہل دنیا کا کسی بات کو اتفاق سمجھ کر ٹال دینا دنیا کے دو مختلف افراد کی نشاندہی کرتا ہے۔

مضمون: عجائبات کا ذھول اور عجائبات کا قبول (ص:118)

(از: آخری مضامین سر سید)

مضمون میں سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ دنیا میں قدرتی عجائبات اس قدر ہیں کہ انسان نہ ان کو سمجھ سکتا ہے نہ گن سکتا ہے۔ مگر جو باتیں روز مرہ میں دیکھنے میں آتی ہے۔ ان کا عجیب تر ہونا انسان کے خیال میں نہیں رہتا اور اس سے ذھول ہو جاتا ہے۔ انسان جب کسی مذہب پر اعتقاد لاتا ہے یا کسی شخص کو مقدس سمجھتا ہے تو عجائبات کو اُس کے ساتھ لگاتا ہے۔ ان سب کو قبول کرتا ہے۔ بلکہ بغیر ان عجائبات کے مذہب کی حقیقت یا اُس شخص کے تقدس کو تسلیم نہیں کرتا۔ مثال: حضرت سلیمانؑ کی نسبت اگر یہ یقین نہ کیا جائے کہ وہ تمام جانوروں کی زبانیں سمجھتے تھے اور ہوا کا تخت اُن کو اڑائے پھرتا تھا۔ جن اور پری اُن کے تابع تھے۔ اس وقت تک اُن کا مقدس ہونا تسلیم نہیں کیا

جاتا ہے۔سر سید احمد خان اس بات کا بھی تذکرہ کرتے ہیں کہ انسان کی جبلت ہے۔کہ جس چیز کو بزرگ سمجھتا ہے۔اور جن اشخاص کو مقدس مانتا ہے اُن کی نسبت ایسے عجائبات منسوب کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب اسلام میں بھی لوگوں نے بہت سے عجائبات شامل کر دیتے ہیں جو قابل یقین نہیں ہے مگر وہ ان کو قبول کرتے ہیں۔سر سید احمد خان اپنے مضمون میں اس بات پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اصلی اور سچا مذہب ایسے عجائبات خلاف فطرت اور خلاف عقل سے بالکل پاک اور خالی ہوتا ہے۔اس میں جس قدر حصہ عجائبات کا ہے۔وہ ان عجائب پرستوں کا شامل ہوا ہے۔ جو قدرت کے عجائبات کو ڈھول کرتے ہیں اور خلاف قدرت اور خلاف عقل عجائبات کو قبول کرتے ہیں۔

کرامت اور معجزہ (ص:123)

(تہذیب الاخلاق بابت 1296ھ صفحہ 31،33)

اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان دین اور دنیا اور تمدن و معاشرت ، بلکہ زندگی کی حالت کو کرامت اور معجزہ پر یقین اور اعتقاد رکھئے سے زیادہ خراب کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔ مذہب اسلام میں جو سب سے زیادہ خوبی ہے وہ یہی ہے کہ اُس نے اپنی سچائی کے ثبوت میں کسی معجزے یا کرامت کا ،حیلہ و بہانہ نہیں کیا۔ بعد میں اس کے پیروؤں نے اپنی غلطی اور کم فہمی سے مذہب کے ساتھ کرامت اور معجزہ کا ایسا لا انتہا سلسلہ باندھ دیا۔اور ایسی باتیں اُس کے نسبت بیان کی۔جن کو خود مذہب اسلام نہ جانتا تھا۔سر سید احمد خان اس بات کی طرف روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس زمانے میں ہماری سوسائٹی کا حال دیکھو کس قدر بزرگوں کے قبروں پر ان کے صاحب کرامات ہونے اعتقاد سے چھلے باندھتے ہیں۔منتیں مانگتے ہیں۔ بچوں کے گلوں میں اور بڑوں کے بازوؤں پر تعویذ کے ڈھیر دکھائی دیتے ہیں۔سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ تمام جاہل اور

وحشی ناتربیت یافتہ ملک وقوم میں معجزے وکرامات کے ماننے والے ہوتے ہیں۔ جب علم کی روشنی سے ملک وقوم روشن ہوجاتی ہےتو ی سب باتیں مٹتی جاتی ہیں۔مضمون کے آخر میں سرسید احمد خان کہتے ہیں کہ مذہب اسلام اُس امر کا جس کولوگ معجزہ کرامت مانتے ہیں سخت مخالف ہے۔قرآن میں سب معجزوں کا ذکر ہیں جیسے انسان کا پیدا کرنا، مینہ برسانا،اناج اُگانا،سورج، چاند،ستاروں کا پیدا کرنا درحقیقت یہی معجزے ہیں جب تک مسلمانوں میں سے معجزے وکرامات کا اعتقاد نہیں جاتا۔اُن کا کامل طور پرمہذب ہونا ناممکن ہے۔

مضمون:عالم غیب(ص:128)

اس مضمون میں سرسید احمد خان لکھتے ہیں کہ غیب کا حال کوئی شخص نہیں جانتا ہےاوروہ یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کس جگہ مرے گا موت کے بعد کیا ہوگا۔

سرسید احمد خان کے مطابق جن حقیقتوں کا پتہ نہیں ہے وہ عالم غیب سے تعبیر کی جاتی ہے۔

اس مضمون سے پتہ چلا ہے کہ دنیا میں ہزاروں چیزیں ایک دوسرے سے مل کر تیسری چیز بن جاتی ہےمگر ہم انکی حقیقت نہیں جانتے۔

سرسید احمد خان نے اپنے اس مضمون میں مختلف روایتیں بیان کی ہےجس سے یہ ظاہر ہے کہ غیب کا علم صرف اللہ ہی کے پاس ہے پس وہ جیسا چاہتا ہے ویسا کرتا ہےاور برائی یا بھلائی کا ہونا بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے۔فرشتوں اورانسانی جسم کے مادوں کوجدا گانہ سمجھا جاتا اوراُسے اعلیٰ قرار دیا جاتا تھا۔اوراس قسم کے خیالات کا انسان میں پیدا ہونا انسانی ذہن میں ایک صورت کا تصور بن کر رفتہ رفتہ وہ خیال مستحکم ہوجاتا ہے۔اورعرب کے بت پرستوں نے اسی منشاء سے اپنے بتوں کی صورتیں بنالی تھیں۔

اس مضمون میں مختلف روایتوں اور احادیث کو بیان کیا گیا ہے ۔جس میں ملائکہ کومخلوق ماننے سے متعلق دلیلیں اور مخلوق نہ ماننے سے متعلق دلیلیں ملتی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی تعریف میں کہا ہے کہ فرشتے ہرحکم کو بجالاتے ہیں اور کبھی نافرمانی نہیں کرتے ہیں۔

مضمون: وراثت (ص:178)

اس مضمون میں بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید بطور قواعد کلید کے ایسے عمدہ اصول پر نازل ہوا ہے کہ کسی زمانے میں بھی اُس کی ترمیم کی حاجت نہیں ہے ہاں بلاشبہ علماء نے جو اپنے رائے سے جو مسئلے قائم کیئے وہ محدود ہیں ۔اور شاید اُن میں غلطی بھی ہے۔اور وہی قابل ترمیم ہیں۔مضمون میں اس بات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ قرآن مجید جائیداد کی تقسیم کا مسئلہ ایسا صاف وصریح وعمدہ و آسان ہے کہ اس سے زیادہ عمدہ ہو نہیں سکتا۔کہ جو شخص جائیداد رکھتا ہے تاکیدی حکم ہے کہ وہ وصیت کرے کہ اس کے مرنے کے بعد کیا کیا جائے۔اس کے دوست اس کو صلاح دیں۔اگر اس کی جائیداد اس سے زیادہ ہو جس قدر کی اس نے وصیت کی ہو یا وصیت کرنے کا موقع نہ ملا ہو تو جائیداد زائد از وصیت یا غیر وصیت شدہ کا بعد ادائے زرقرضہ اُس کے وارثوں میں تقسیم ہونے کا حکم ہے۔لیکن علماء نے اپنے رائے سے اس مسئلے کو تنگ وخراب کر دیا ہے اور وصیت کی نسبت قیدیں وشرطیں لگائیں۔حالانکہ قرآن مجید میں کوئی قید وشرط نہیں ہے۔مضمون کے آخر میں اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ قرآن مجید نے وصیت کے مسئلہ کو ایسی وسعت کے ساتھ قائم کر دیا ہے جس میں وصیت کرنے والے کو کلیۃً اختیار حاصل ہے۔

مضمون: جوتی پہنے ہوئے نماز پڑھنی (ص:181)

(از تہذیب الاخلاق بابت یکم محرم 1289ھ)

اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ جوتا پہن کر نماز پڑھنی سنت ہیں صرف اتنا دیکھ لینا چاہئے کہ کوئی نجاست ظاہری اس میں لگی ہوئی نہ ہو۔ اگر نہ ہو تو اس کو سخت چیز سے یا زمین سے رگڑ ڈالے اور پہن کر نماز پڑھ لے۔ جوتیاں پہن کر نماز پڑھنے سے واسوسیوں کا دل خوش نہیں ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ سنت آپ ﷺ اور اُن کے اصحاب کی ہے۔ فعل اور حکم دونوں کے اعتبار ہے۔ اس مضمون میں اس بات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ شراد ابن اوس کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہودیوں کے خلاف کرو کہ وہ اپنے موزوں اور جوتوں سے نماز نہیں پڑھتے۔ روایت کیا ہے ابوداؤد نے مضمون کے آخر میں سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ تمام تحقیقات جو اس امر کی نسبت شیخ امام ابو عبداللہ محمد بن ابی بکر عرف ابن قیم نے اپنی کتاب میں ''اغاثۃ اللھفان فی مصاید الشیطان'' میں لکھا ہے۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جوتی پہنے ہوئے مسجد میں جانا اور جوتی پہنے ہوئے نماز پڑھنا ایک عام عادت تھی۔ مگر اس زمانہ میں اور بالخصوص ہندوستان میں مسلمانوں نے اس بات کو اپنی غلطی سے معیوب سمجھا ہے۔

مضمون: خطبہ میں بادشاہ کا نام (ص:184)

اس مضمون میں سر سید احمد خان نے پوانیر اخبار میں جمعہ کے خطبہ سے متعلق ایک تحریر پر تبصرہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ خطبہ عید ہو یا خطبہ جمعہ اس میں صرف خدا کی تعریف اور مسلمانوں کو نیکی اختیار کرنے کی نصیحت ہوتی ہے اور ہونی چاہئے۔ اس مضمون سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ پیغمبر اسلام اور خلفائے راشدین کے دور میں خطبہ نہیں بڑھا جاتا تھا مگر بعد میں تعظیم کے مقصد سے خطبہ میں

خلفائے راشدین کا نام لیا جانے لگا تھا مگر بعد میں بادشاہ وقت کا نام بھی خطبہ میں لینا شروع ہوا در مختار کتاب کا مطالبہ کرنے پر یہ واضح ہوا کہ خطبہ میں بادشاہ کے لئے دعا کرنا کوئی مذہبی ثواب کا کام نہیں جبکہ کچھ عالم نے اسے بدعت بتائے ہوئے خطبہ میں حدف نصیحت ہونے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

مصنف نے اپنے مضمون میں درمختار کا کچھ حصہ بھی شامل کیا ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بادشاہ کے لئے دعا کی جاسکتی ہے مگر اُسکی تعریف نہیں کی جاسکتی ہے۔

ان تمام تحقیقات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خطبہ میں بادشاہ کا نام لینا یا دعا کرنا کوئی مذہبی مسئلہ نہیں ہے بلکہ مذہب کی رو سے بدعت ہے۔

سر سید احمد خان نے مزید لکھا ہے کہ ہندوستان کی اکثر مساجدوں میں بادشاہ سے عدل و انصاف کی حکومت، مذہبی فرائض میں دست اندازی، جان، مال کی حفاظت و دیگر عائیہ کلمات استعمال کئے جاتے تھے جو کہ حقیقت میں بادشاہ کے لئے نہیں بلکہ مسلمانوں کی بھلائی ے لئے ہوا کرتے تھے۔

اس مضمون سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ کسی بادشاہ کا خطبہ میں نام لینا کسی مسئلہ پر مبنی ہے اور مسلمانوں کو اس بادشاہ کے مذہب کی رو سے کوئی مذہبی اطاعت واجب ہے صحیح نہیں ہے۔

مضمون: زمانہ کا اثر مذہب پر (ص:189)

(از تہذیب الاخلاق یکم شوال)(1311ھ جلد اول نمبر اول دور سوم صفحہ 14)

اس مضمون میں بتایا گیا ہے کہ زمانہ انسان پر سب سے بڑا اثر ڈالنے والا ہے۔ وہ انسان کے خیالات، اعتقادات، رسم و رواج کو اپنے پوشیدہ اثروں سے جو معلوم نہیں ہوتے بدلتا جاتا

ہے۔ مضمون میں اس بات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ زمانے کے اعتبار سے خود انسان کے خیالات اوراس کے معلومات میں ترقی ہوتی جاتی ہے اور نئے علوم وفنون کے ذریعہ انسان پر موثر ہوتے ہیں۔ جس طرح دنیوی خیالات، عادات اور رسم ورواج حالات تمدن اور معاشرت پر زمانہ موثر ہوتا ہے۔ اُسی طرح مذہب واعتقاد پر بھی زمانہ کا اثر پڑتا ہے اس مضمون میں بتایا گیا ہے کہ ایک زمانہ یقین کا زمانہ کہلاتا تھا۔ جو بات کہی جاتی گویا وہ کیسی ہی عجیب ہو یقین کر لی جاتی تھی۔ مگر وہ زمانہ اب نہیں رہا شک کا زمانہ ہے۔ جب تک کسی بات کا یقین نہ آئے مانی نہیں جاتی۔ سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ ہمارے پیشوایان مذہب اس خرابی سے جو ضرور ہونے والی تھی۔ بے خبر نہ تھے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کا مذہب ان کے سامنے تھے ان کے حکایات، واقعات اوراقوال میں تغیر وتبدل ہونے کے سبب بجائے ان پر مذہب حق کا اطلاق ہوگا۔ مذہب باطل کا اطلاق ہوتا تھا۔ ہمارے پیشواؤں کو خوف تھا کہ مذہب اسلام میں بھی یہی آفت نازل نہ ہو۔ اس لیئے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے لوگوں کو جمع کر کے کہا کہ تم رسول ﷺ کی بہت حدیثیں بیان کرتے ہو۔ اوران میں اختلاف کرتے ہو اور تمہارے بعد کے لوگ اور زیادہ اختلاف کریں گے پس تم آپ ﷺ سے کوئی حدیث نہ بیان کرو۔ کوئی اگر تم سے پوچھے تو کہہ دینا کہ تمہارے اور ہم میں اللہ کی کتاب یعنی قرآن مجید ہے۔ اس مضمون کے آخر میں اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ جو حدیثیں اور روایتیں پچھلے عالموں اور زاہدوں نے کتابوں میں لکھی ہے۔ انہیں پر ہمارا اعتماد کافی نہیں ہے۔ بلکہ خود اس کو سوچنا، سمجھنا اور سمجھانا واجب ہے۔

مضمون:صبا ناصبانا(ص:242)

(از:''آخری مضامین سرسید'')

اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ جولوگ اپنا مذہب چھوڑ کر دوسرے مذہب میں آتے ہیں آخران کے دل میں کیا بات پیدا ہوتی ہے جس کے سبب وہ دوسرا مذہب اختیار کرتے ہیں اگر کوئی شخص اپنے مذہب میں سخت احکام پابندیوں کی وجہ سے دوسرا مذہب اختیار کرتا ہے تو وہ لالچ سے کم نہیں ہوتا ہے۔اس بات کا بھی یقین نہیں کیا جاسکتا ہے کہ جو دوسرا مذہب اختیار کرنے سے پہلے اس کا تمام مسائل اور عقائد پر غور کر کے ہر ایک مسئلے اور عقیدہ کو دوسرے مذہب کے عقائد اور مسائل پر ترجیح دے کر دوسرا مذہب اختیار کیا ہو۔کیونکہ یہ امر نہایت مشکل کام ہے۔اس مضمون میں اس بات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ مذہب حق اختیار کرنا خدا کی ہدایت پر موقوف ہوتا ہے۔مگران کی نسبت ہم کیا کہیں کہ جو مذہب حق کو چھوڑ کر دوسرا مذہب جو گمراہی ہے اختیار کرتے ہیں۔کسی شخص کو کسی مذہب کی باتیں سچ اور صحیح معلوم ہونے لگتی ہے۔اور وہ نیک نیتی اور سچے دل سے اسے برحق سمجھتا ہے اور اُس مذہب کو اختیار کر لیتا ہے۔اس کا سبب زیادہ تر اس مذہب کے لوگوں کی بزرگی،تقدس اور اخلاق کی خوبی،نیک خصلت پر منحصر ہوتا ہے۔جو اُس مذہب کو پھیلانا چاہتے ہیں وہ ولگ بھی وہی کرتے ہیں جو کہتے ہیں اُن کا قول اور فعل،ظاہر و باطن سب یکساں ہوتا ہے۔انبیاء علیہ السلام ان تمام صفات کے جامع ہوتے ہیں۔اور وہ معصوم ہوتے ہیں اگر وہ معصوم نہ ہوں تو اُن سے پوری امت کی ہدایت غیر ممکن ہے۔مضمون میں اس بات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ جن لوگوں نے روحانی نیکی حاصل کرنے پر توجہ کی ہے۔خواہ وہ عالم ہوں یا جاہل اگر عالم ہوں تو نور علی نور ہیں۔ان کے اخلاق و اوصاف انبیاءؑ کے اخلاق و اوصاف کے مشابہہ ہوجاتے ہیں۔مضمون کے آخر میں کہا گیا ہے کہ ہندوستان میں یہی حال ہے کہ علماء کے

ذریعہ دو چار، دس آدمی مسلمان ہوئے ہیں مگر فقراء اور اولیا اللہ کی بدولت ہزاروں، لاکھوں آدمی مسلمان ہوتے ہیں۔ پس مذہب کی خوبی ان ہی لوگوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ جو نیکی کا مجسمہ کہلاتے ہیں۔

مضمون: العجب ثم العجب (ص:246)

اس مضمون میں سرسید احمد خان نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی کتاب تفہیمات الٰہیہ پر روشنی ڈالی ہے جس میں انہوں نے 4 دوروں کا ذکر کیا ہے۔ پہلے دور میں معدنیات دوسرے دور میں نباتات تیسرے دور میں حیوانات اور پھر آخری دور میں انسانات کے پیدا ہونے کی صورت حال بتائی ہے اور لکھا ہے کہ آدم علیہ سلام کی نوح چوتھی صورت میں یعنی کہ حیوانات کی صورت میں اللہ نے تبدیلی کرتے ہوئے انسانوں کو پیدا فرما کر انسانوں کو محبوب خلقت کا درجہ دیا ہے۔ شاہ ولی کی اس تحریر پر مزید تبصرہ کرتے ہوئے سرسید احمد خان نے سورہ احزاب کی آیت نمبر 72 کا حوالہ دیا ہے۔ انہوں نے یہ سوال کیا ہے کہ حضرت نے جن 4 دوروں کا ہونا بیان کیا ہے وہ کہاں سے اخذ کیا ہے۔ اور واضح دلیل ملنے تک کوئی قطعی فیصلہ نہ کرنے کی بات کہی ہے۔ توریت کا ذکر کرتے ہوئے سرسید احمد خان نے لکھا ہے کہ ولی اللہ اور توریت میں جو بیانات ہیں وہ یکساں نہیں ہیں۔

مضمون: سبع ارضین (ص:250)

سرسید احمد خان کے اس مضمون میں انہوں نے زمین کو آسمانوں سے مماثلت کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اللہ نے اپنی قدرت سے آسمانوں کو اور زمینوں کو پیدا کیا ہے۔ سبع سمٰوات کا مطلب ہے سات زمینیں اور کچھ عرب یہ خیال کرتے تھے کہ زمینیں متعدد نہیں ہے لیکن سرسید نے اپنے اس مضامین کے ذریعہ مختلف احادیث کو بیان کیا ہے۔ جس میں علماء نے سات

زمینوں سے زمین کے ساتھ طبقے مراد لئے ہیں۔ جنکا قرآن میں ہی ذکرنہیں کیا گیا ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ لفظ مسلھن سے سات زمینوں اور سات آدم، سات ابراہیم اور سات عیسیٰ کے ہونے پر استدلال کرنا غلط ہے۔ سر سید احمد خان کے اس مضمون سے یہ بھی انکشاف ہوا ہے کہ سات زمینوں کے ہونے کا بیان غلط ہے کیونکہ دنیا میں سات زمینوں کا کوئی وجودنہیں ہے اور علم ہئیت سے چاہے وہ علم قدیم ہو یا جدید زمین کے تھے اور متعدد زمینوں کا ہونا ثابت نہیں ہے۔

مضمون: اہل سنت والجماعت کے لئے مجتہد کی ضرورت (ص:290)

سر سید احمد خان لکھتے ہیں کہ اہل سنت و جماعت نے اجتہاد کے ختم ہونے کا مسئلہ بتایا تھا مگر بعض کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ ہر زمانے میں مجتہد کا ہونا ضروری ہے اور اہل سنت والجماعت نے اجتہاد کو ختم اور مجتہد کو معدوم مان کر بڑی غلطی کی ہے۔

اپنے اس مضمون کے ذریعہ سر سید احمد خان نے مسلمانوں کو دین و دنیا سے متعلق کسی بھی بات پر تحقیق کرنے کے لئے کہا ہے۔ انکا کہنا ہے کہ مجتہد العصر وزمان کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

اور اپنے اس مضمون کو شائع کرتے ہوئے وہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ ہر زمانہ میں کسی نہ کسی صاحب علم کی ضرورت ہے۔ جو لوگوں کو سچے دین اسلام کی جانب رہنمائی کرے اور مسلمانوں کے غلط خیالات کا ازالہ کرتا رہے اور فضول توہمات کو دور کرے۔

سر سید احمد خان کے اس مضمون کے شائع ہونے کے انکے مخالفین بہت شور مچایا کہ وہ مجتہد بننے کے لئے یہ سب کر رہے ہیں اور اسی لئے انہوں نے یہ مضمون شائع کیا ہے۔ مگر حقیقت کچھ اور تھی انہوں نے اپنے آپکو کبھی بھی مجتہد نہیں جانا تھا اور نہ ہی کہلوایا تھا مگر انکے معتقدین انہیں مجتہد تسلیم کرنے لگے تھے۔

محبت(ص:293)

(ازمقالات سرسید صفحہ 142-143)

اس مضمون میں جب ایمانی اور حب انسانی محبت کا تذکرہ کرتے ہوئے سرسید احمد خان کہتے ہیں کہ جب ایمانی محبت غیر مذہب سے رکھنی شرعاً ممنوع اور حرام بلکہ کفر ہے۔ اور جب انسانی محبت شرعاً ممنوع نہیں ہے۔ دونوں قسم کی محبت میں تفرقہ وتمیز موجود ہے۔ کہ ایک قسم کی محبت اُن اسباب ظاہری کے باعث تھی جو فطرت انسانی ایک کو دوسرے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسری قسم کی محبت باوجود معدوم ہونے ان تمام اسباب ظاہری کے من حیث الدین تھی۔ اس مضمون کے آخر میں یہ بتایا گیا ہے کہ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ غیر مہذیب والوں سے سچی اور دلی محبت کرنا ممنوع ہے یہ اُن کی غلطی ہے جو چیز کہ خدا تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں بنائی ہے۔ وہ برحق اور بالکل سچ ہے ہم کو تمام دوستوں سے خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں سچی دوستی اور دلی محبت رکھنی اور برتنی چاہئے۔ مگر وہ تمام محبت اور دوستی جب انسانی کے درجہ میں ہو نہ کہ حب ایمانی کے۔ حب ایمانی بلا اتحاد مذہب، بلکہ بلا اتحاد مشرب ہونی غیر ممکن ہے۔ اور سرسید احمد خان کہتے ہیں کہ میں سمجھتا ہوں کہ یہی ہدایت ہم کو ہمارے سچے مذہب اسلام نے کی ہے۔

مضمون: مسائل متفقہ(ص:296)

سرسید احمد خان اپنے اس مضمون میں لکھتے ہیں کہ قلبی اتحاد کے باوجود مہدی کو متعدد مسائل میں اختلاف ہے جو کہ پرچہ تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئی تحریروں سے ظاہر ہو چکا ہے مگر کچھ ایسے مسائل بھی ہیں جن میں مخدوم مولوی مہدی علی بھی اتفاق رکھتے ہیں۔

وہ مسائل کچھ یوں ہیں:

1. کتب مقدسہ میں معنوی تحریف کے علاوہ اور کوئی تحریف نہیں ہوئی ہے۔

2. اسلام میں غلام لونڈی بنانا جائز نہیں ہے۔

3. طوفان نوح صرف حضرت نوحؑ کی قوم پر آیا تھا۔

4. اجماع حجت نہیں ہے۔

5. تقلید واجب نہیں ہے۔

6. آسمانوں کا جسمانی وجود نہیں ہے۔اور

7. جن باتوں کے متعلق کتاب اور سنت میں کوئی نقص موجود نہیں انکے بارے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔وہ مزید مسائل بیان کرتے ہیں جن میں

8. قرآن کریم کی جو کچھ نازل ہوا وہ کتاب کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔

9. اور قرآنی آیتوں کی منسوخی نہیں ہوئی ہے۔

10. رسول اللہ ﷺ کے بعد خلافت نبوی نہیں ہے۔مذکورہ بالا ایسے مسائل ہیں جن میں مہدی علی اور سر سید احمد خان دونوں بھی متفق تھے اور انہوں نے امید ظاہر کی تھی کہ محقق کے بعد اور بھی مسائل میں دونوں متفق ہونگے۔

کتاب	مرتب	حصہ ہشتم	ناشر/مقام اشاعت	سن اشاعت
اردو کا کلاسیکی ادب ''مقالات سرسید''	مولانا محمد اسماعیل پانی پتی	تعلیمی، تربیتی اور معاشرتی مضامین	مجلس ترقی ادب نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ لاہور	1962ء

مضمون: علم (ص:1)

اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان اور جانوروں میں بہت ساری چیزیں مشترک ہوتی ہیں۔ صرف یہ فرق پایا جاتا ہے کہ جانوروں میں محدود خیالات ہوتے ہیں اور انسان میں نا محدود اور جانوروں میں ایک ہی خیالات اور ایک ہی سا یقین رکھتے ہیں۔ لیکن انسان نہ ہی ایک خیال رکھتا ہے اور نہ ہی ایک سا یقین۔ اس مضمون میں انسان کے خیالات کا تذکرہ کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ علم حاصل کرنے کے لئے عقل صرف ایک آلہ ہوتی ہے اور جانوروں سے زیادہ انسان کو جو کچھ کرنا ہے وہ صرف تمام باتوں کی اصلیت دریافت کرنا ہے۔ جو کہ صرف علم کے ذریعہ ہی حاصل کی جاسکتی ہے۔

مضمون: تعلیم (ص:4)

اس مضمون میں تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ جس ملک میں جو زبان حکومت کرتی ہے اسی زبان کا عروج ہوتا ہے۔ مضمون میں اس بات کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ مسلمانان انگریزی زبان پڑھنے کو مخالف مذہب اسلام سمجھتے تھے۔ لیکن وقت کے ساتھ

مسلمانان نے انگریزی زبان کو اہمیت دی۔اس مضمون میں پچھلے اور اس زمانے کی تعلیم پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ پچھلے زمانے کی تعلیم میں ہر شخص اعلیٰ درجہ کی تعلیم اور اس فن کا ماسٹر ہوتا تھا۔لیکن اس زمانے کی تعلیم انگریزی میں ایسا کوئی سامان نہیں جو شخص علم کی کسی شاخ میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم پاتا چاہے تو اعلیٰ درجہ کی تعلیم پاکر اس فن کا ماہر ہو سکے۔اس مضمون میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ تعلیم کا اصل مقصد یہ ہے کہ لوگ نیک مخلص اور عمدہ قسم کے باشندہ بن جائیں۔اخلاقی اور سائنسی تعلیم کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔مضمون کے آخر میں اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ بڑی ضرورت ہندوستان میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم کی اور اخلاقی اور سماجی حالت کی درستی کی ہے۔

مضمون: انسان میں تمام خوبیاں تعلیم سے پیدا ہوتی ہے (ص:12)

اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس طرح سنگ مرمر کو سنگتراش تراش کر اس کے چھپے جوہر کو منظر عام پر لاتا ہے کہ اسی طرح انسان کی روح کا حال ہوتا ہے جب تک اس پر عمدہ تعلیم کا اثر نہیں ہوتا ہے۔اس وقت تک ہر ایک نیکی اور تمام خوبیاں جو اس میں چھپی ہوئی ہوتی ہے۔تعلیم کے بغیر نمود نہیں ہوسکتی۔اس مضمون میں سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ اپنی قوم میں نیکیاں دیکھتا ہوں پر ناشائستہ ان میں نہایت دلیری اور جرأت پاتا ہوں پر خوفناک، ان میں نہایت قوی استقلال دیکھتا ہوں پر بے ڈھنگا ان کو نہایت دانا اور عقلمند پاتا ہوں پر اکثر مکر و فریب اور زور سے ملے ہوئے۔ان میں صبر و قناعت بھی اعلیٰ درجے کی ہے مگر غیر مفید اور بے موقع۔مضمون میں سر سید احمد خان اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اوپر تمام صفات عمدہ تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو جائے تو دین اور دنیا دونوں کیلئے مفید ہونگی اور آخر میں سر سید احمد خان نے اپنی خواہش کا اظہار کیا ہے کہ اس قسم کی تحریرات سے نیکی کو ترقی دونگا اور انسان کے دل کی درستی میں کچھ کچھ مدد کرتا رہونگا۔

مضمون: تعلیم وتربیت، (ص:15)

اس مضمون کا تذکرہ سرسید احمد خاں کی کتاب انتخاب مضامین سرسید میں کیا جا چکا ہے۔

مضمون: تربیت اطفال (ص:18)

اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو عمر اور وقت تربیت کا ہوتا ہے۔ جب وہ گزر جاتا ہے تو بجز لا علاج رنج رہ جانے کے اور کچھ نہیں ہوتا ہے۔ اس مضمون میں اس بات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں میں تربیت اطفال کا کوئی ذریعہ موجود نہیں ہے۔ اور بڑا سبب اُن کی حالت کے تباہ ہونے اور اولاد کے نالائق رہنے یا آوارہ ہو جانے کا یہی ہے۔ اور ایسی تربیت کا نتیجہ ہوتا ہے کہ لڑکوں کے خیالات مثل جانوروں کے خیالات کے محدود ہو جاتے ہیں اور کسی قسم کی ترقی کا مادہ ۔ان میں نہیں رہتا۔ اس مضمون میں اس بات کی جانب بھی آگاہی کی گئی ہے کہ زمانہ تربیت اور تحصیل علم میں لڑکوں کی زندگی بسر کرنے کی کیا تدبیر کرنی چاہئے۔ جس سے مقاصد مذکورہ، بخوب ترین وجوہ حاصل ہوں۔ مضمون کے آخر میں سرسید احمد خان نے اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ لڑکوں کی تعلیم کا فرض والدین اور قوم دونوں پر لازم ہوتا ہے۔

مضمون: غیر مفید تعلیم (ص:25)

اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایسی تعلیم جو حسب احتیاط وقت نہ ہو اُس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ لوگ اول مفلس اور محتاج اور پھر نالائق اور کاہل اور پھر ذلیل وخوار پھر چور اور بدمعاش ہو جاتے ہیں۔ مضمون میں اس بات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ مفلسی کا اصلی سبب جہل ہے۔ اور غیر مفید علوم کا عالم اور جاہل دونوں برابر ہوتے ہیں کیونکہ اُن سے نہ لوگوں کو کچھ فائدہ ہوتا ہے اور نہ وہ خود کچھ اپنا بھلا کر سکتے ہیں۔ مضمون میں اس بات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ جو علوم مسلمانوں

میں مروج ہے وہ بلاشبہ غیر مفید ہے۔اور حسب احتیاج وقت نہیں ہے۔اور یہی باعث اُن کی مفلسی اورمحتاجی کا ہے۔مضمون کے آخر میں یہ کہا گیا ہے کہ مسلمان تعصب کو چھوڑ دیں اور ایسا سلسلہ تعلیم قائم کریں جواُن کے دین اور دنیا دونوں کے لئے مفید ہو۔

مضمون:طریقہ تعلیم مسلمانان (ص:72)

اس مضمون میں ایک کمپنی کے ذریعہ مسلمانان تعلیم کے لئے کون سا عمدہ طریقہ ہے اور کون کون سا علوم کس طرح اُن کو پڑھائے جائے ان باتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔مضمون میں اس بات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ زمانہ اور زمانہ کی طبیعت اور علوم اور علوم کے نتائج سب تبدیل ہوگئے ہیں۔قدیم کتابیں اوران کا طرز بیان،الفاظ مستعملہ ہم کوآزادی اور راستی اور صفائی،سادہ پن اور بے تکلفی اور بات کی اصلیت تک پہونچنا۔اس کی تعلیم نہیں دیتے۔اس مضمون میں سرسید احمد خان نے اکثر مصنفین رسالوں کے اس بات سے اختلاف کیا ہے کہ انگریزی زبان اورعلوم کی تعلیم کے ساتھ عربی کی تعلیم بھی دی جائے۔مضمون کے آخر میں یہ بتایا گیا ہے کہ سرسید احمد خان کی طریقہ تعلیم مسلمانان کے تعلق سے تجویز سننے کے بعد ممبران شریک کمیٹی اس بات پر متفق ہوئے کہ مسلمانوں کا طریقہ تعلیم دوطریقہ کا ہونا چاہئے۔ایک وہ جوخود مسلمان اُس کو قائم کریں جس سے ان تمام مقاصد دینی اور دنیاوی انجام پائیں اور دوسرے وہ جن سے مسلمان ان اصول وقواعد سے جوگورنمنٹ نے تعلیم کے لئے مقرر کئے فائدہ اُٹھائیں۔

مضمون:مذہب اورعام تعلیم (ص:100)

اس مضمون میں سرسید احمد خان نے نہایت اہم امر کی جانب مسلمانوں کوتوجہ دلائی ہے کہ دنیوی تعلیم کے ساتھ بچوں کو مذہبی تعلیم بھی لازمی طور پر دینی چاہئے ورنہ کبھی حقیقی ترقی نہیں ہوسکتی

اورقوم اصلی تہذیب وشائستگی سے محروم رہتی ہے۔ کیونکہ پسندیدہ اخلاق مذہب پر مضبوطی سے قائم ہونے کے بغیر کبھی کچھ حاصل نہیں ہوسکتے۔ اور جب تک اخلاق بلند اور عادات پسندیدہ نہ ہوں قوم کبھی مہذیب اور شائستہ نہیں بن سکتی۔ مضمون کے آخر میں اس بات کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ ہر ضلع میں ایک ایسا مدرسہ ہونا چاہئے جس سے ہر قسم کے مطالب اور مقاصد پورے ہوں۔ اور ہر شخص اپنے مقصد کے تحت تعلیم کو حاصل کریں۔ جب ایسا انتظام اور سلسلہ قائم ہوگا تب ہی مسلمانوں کی تربیت اور دینی ودنیاوی ترقی کی توقع ممکن ہے۔

مضمون: نظامیہ سلسلہ تعلیم (ص:109)

اس مضمون میں اس سلسلہ تعلیم کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو بالفعل ہندوستان کے مسلمانوں میں رائج ہے جو سلسلہ نظامیہ کہلاتا ہے۔ اس مضمون کے ذریعہ اس بات پر غور کرنے کی جانب راغب کیا گیا ہے کہ بلحاظ حالات اور علوم مروجہ زمانہ حال کے آیا یہ سلسلہ اور طریقہ درحقیقت کافی اور مفید ہے یا واقعی اس میں تغیر وتبدیلی کی ضرورت ہے۔ اس مضمون میں اُن علوم اور کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو بالفعل درس میں داخل ہیں۔ تاکہ جو لوگ اس پر بحث کرنے پر آمادہ ہوں اُن کو کسی قدر امداد ملے۔ مضمون کے آخر میں سرسید احمد خان اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ذی عقل اور دانش مند لوگ غور کر کے اس بات کی تنقیح فرمالیں کہ آیا یہ سلسلہ تعلیم کافی ہے یا تبدیلی کی اس میں ضرورت ہے۔ نظامیہ سلسلہ تعلیم کے طریقہ کار ہی کے برصغیر تمام میں مسلمانوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا جاتا تھا۔

مضمون: مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے متعلق گورنمنٹ کا فرمان (ص:114)

مضمون میں اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ کس طرح فرمان نسبت ترقی تعلیم مسلمانان

کے 13 / جون 1873ء کو جاری کیا تھا اور گورنمنٹ نے بہت زیادہ توجہ ترقی تعلیم مسلمانوں کے فرمائی ہے۔مضمون میں اس بات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ جہاں تک ممکن تھا گورنمنٹ نے ان کی تعلیم کے ذریعوں کے قائم کرنے کی اجازت دی تھی۔مضمون میں اس بات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ اگر مسلمان خود اپنی تعلیم کی تدبیر آپ کریں گے تو گورنمنٹ کی ہزاروں تدبیروں سے زیادہ مفید ہوگی۔مضمون کے آخر میں سرسید احمد خان اپنے ہم وطنوں سے گزارش کرتے ہیں کہ اپنی قوم کی ترقی تعلیم کی طرف خود متوجہ ہوں اور دینی و دنیاوی فائدہ حاصل کریں۔

مضمون: مسلمان اور تعلیم زبان انگریزی (ص:130)

اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ موجودہ دور میں جس طرح علم وفنون نے بہت کچھ ترقی کرلی ہے۔اسی طرح مسلمانوں کو بھی مذہب کے لیئے کسی یوروپ کی زبان کے ذریعہ سے اُن علوم کے حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔اس مضمون میں اس بات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ دنیاوی ضرورتوں کے لیئے انگریزی زبان کا سیکھنا نہایت ضروری ہے۔لیکن مسلمانوں کو اس کی تحصیل میں جو مشکلیں ہے ان کا حل ہونا دشوار معلوم ہوتا ہے۔مضمون میں اس بات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ غریب تعلیمی اخراجات برداشت نہیں کر پاتا اور متوسط لوگ ایسی رسومات اور اخراجات لغو اور بے ہودہ میں مبتلا ہے اور ہر طرح زر کثیر اس میں خرچ کرتے ہیں۔لیکن اولاد کی تعلیم کا بندوبست نہیں کرتے۔مضمون کے آخر میں اس بات کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ قوم کو مسلمانوں کی تعلیم کا خیال پیدا ہو گیا ہے مگر اس بات کا سبب معلوم نہیں ہوتا کہ کیوں ان کے دل میں یہ بات سمائی ہے کہ قوم کے لیئے اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا ساماں مہیا کرنے کے بدلے چھوٹے اور ناقص مدرسے قائم کریں۔ان نامعلوم اسباب کو قسمت سے تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہے کہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ تعلیم پانے نہیں دیتی۔

مضمون: عام تعلیم پرشیا میں (ص:156)

پرشیا واقع جرمنی کی عام تعلیم کی بابت 1861ء میں ایک رپورٹ چھپی تھی جس کا تذکرہ سر سید احمد خان نے اس مضمون میں کیا ہے تاکہ مسلمان یہ جان سکے کہ تربیت یافتہ قوموں میں کس درجہ تک تعلیم کی ترقی ہے۔ مضمون میں اس بات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ پرشیا میں فی ہزار ایک آدمی بھی اَن پڑھ بہ مشکل نکلے گا۔ مضمون میں اس بات کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ جرمنی میں جو رعایا کی تعلیم کا قانون ہے عمدہ ہے لیکن ہندوستان کے قانون سے کسی قدر مناسبت نہیں رکھتا۔ مضمون کے آخر میں سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ جب تک ہندوستان کی ہر اک قوم خود آپ اپنی قوم کی تربیت کی طرف متوجہ نہ ہوگی اور قوم کی تعلیم کا بندوبست نہ کرے گی اس وقت تک قوی تعلیم کا ہونا غیر ممکن ہے۔ کیونکہ مسلمان لغو خیالات اور تعصّبات میں مبتلا ہے اپنی قوم کی بھلائی اور ان کی تربیت کی فکر نہیں کرتے۔

مضمون: مصر میں علوم کی تعلیم (ص:159)

اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ مصر نے اعلیٰ درجہ کی تعلیم پھیلانے کے لیے نہایت عمدہ ترجمے کیئے اور مفید مفید کتابیں لکھنے کی جو کوشش کی تھی وہ بے کار ہوگئی کیونکہ ان کے ترجمے ہو کر درس میں آنے تک علوم وفنون نے ایسی ترقی کر لی کہ وہ کتابیں بے کار ہوگئی۔ مضمون میں اس بات کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے کہ جب تک کسی زبان میں کافی لیاقت حاصل نہ ہو۔ جس زبان میں وہ علم پیدا ہوتے ہیں اور ترقی پاتے ہیں اعلیٰ درجہ کی تعلیم حاصل نہیں ہوسکتی۔ مضمون میں اس بات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ جو مقدس اشخاص علوم مفیدہ کے حاصل کرنے سے قوم کو باز رکھتے ہیں اور مذہبی تعصب کو کام میں لاتے ہیں۔ وہ قوم کے اسلام کے اور مسلمانوں کے درحقیقت دشمن ہوتے ہیں۔ مضمون کے آخر میں سر سید احمد خان اس بات کی جانب توجہ مرکوز کرواتے ہوئے کہتے ہیں کہ

مسلمان مختلف ملکوں میں آباد ہے اور مختلف قوموں کے لوگ ہے اوران کی حیثیت بھی مختلف ہے۔ کہیں خودمختار بادشاہ تو کہیں خودمسلمان کی بادشاہ کی رعیت ہے۔کیا اسباب ہیں کہ حالت سب کی یکساں ہے جو حالت ہندوستان کے مسلمانوں کی ہے وہی مصر کے مسلمانوں کے حالات ہے۔ مسلمانوں کی بہبودی چاہنے والوں کواس بات پرغور کرنا نہایت ضروری ہے۔

مضمون:مصر کی معاشرت اوراس کی تہذیب (ص:164)

مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح مسلمان ریاستوں میں سے مصر نے تہذیب و شائستگی میں ترقی کی ہے۔اس مضمون میں اس بات پربھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ مذہب قوم میں بھی نقص یا عیب ہوتا ہے۔مگران برائیوں کے ساتھ کروڑوں بھلائیاں بھی ہوتی ہے۔جبکہ نا مہذب قوم میں بجز برائیوں کےاور کچھ نہیں دکھائی دیتا ہے۔یہ نیکی بھی اس طرح کرتی ہے کہ نیکی نیکی نہیں رہتی یا غیر مفید اور بے عمل ہوجاتی ہے اور مہذب قوم نیکی بھی ایسے سلیقے وخوبی سے کرتی ہے کہ نیکی زیادہ عمدہ اور بہت مفید اور برمحل ہوتی ہے مضمون کے آخر میں سرسید احمد خان اس زمانے کے مسلمانوں کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر کسی مہذب قوم کا ذکر ان کے سامنے کیا جائے تو مسلمان بھائی ان کے برائیوں اور عیبوں کا ذکر کرتے ہیں۔جبکہ مسلمانوں کو اپنے اندر کے عیب دیکھنا چاہئے۔نہ کہ دوسروں کے عیب کیونکہ دوسروں میں عیبوں کے ساتھ بھلائیاں بھی ہے جبکہ ہم میں صرف عیب ہی عیب ہے۔

مضمون:مجل سراخدیو مصر کی ناگفتہ بہ حالت (ص:175)

اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہندوستان کے کسی نواب یا راجہ،مسلمان امیر یا مستمول ہندو کے اخراجات کا تخمینہ کریں تو مذہب قوم اُسی درجہ کے امیروں سے زیادہ نکلے گا۔اس کے

باوجود مہذب قوم کے لوگ فرشتوں کی مانند صفائی اور لطافت اور خوبی سے زندگی بسر کرتے ہیں اور ہندوستان کے لوگ ایک میلے کچیلے جانور کی طرح۔ سرسید احمد خان نے مضمون میں اس بات پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ تربیت اور عادت کو تہذیب میں بہت بڑا دخل ہے ہماری تربیت اسے ناقص طریقہ پر ہوتی ہے جس کے سبب سے ہماری طبیعتوں میں صفائی اور نفاست نہیں رہی۔ اس مضمون میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ابراہیم پاشاہ، خدیو مصر کے بڑے بیٹے کی پرورش کے لئے لندن سے آئی عورت املین لاٹ محل سرائے خدیو مصر کی ناگفتہ بہ حالت پر ایک کتاب لکھتی ہے اور وہاں کی کمیوں پر روشنی ڈالتی ہے۔ مضمون کے آخر میں سرسید احمد خان کہتے ہیں کہ زمانے سے جس کا حال املین لاٹ نے لکھا ہے۔ مصر اب زیادہ ترقی پر ہے اور یوروپ سے زیادہ اختلاف ہونے کے سبب تہذیب، وشائستگی میں اُس نے بہت ترقی کرلی۔

کتاب	مصنف/مرتب	حصہ نہم	ناشر/مقام اشاعت	سن اشاعت
اردو کا کلاسیکی ادب مقالات سرسید	مولانا محمد اسماعیل پانی پتی	ملکی وسیاسی مضامین	مجلس ترقی آدب نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ۔ لاہور	ندارد

مضمون: نامذہب ملک اور نامہذب گورنمنٹ (ص:1)

اس مضمون میں تہذیب اور گورنمنٹ پر اسکے اثرات سے متعلق بتایا گیا ہے۔ ملک جب نامہذب ہوتو حکومت میں بھی اسکی جھلک نظر آتی ہے اور جب حکومت مہذب ہوتی ہے تو کسی نہ کسی قدر تہذیب ملک میں پائی جاتی ہے۔

ملک کے نامہذب ہونے کا مطلب، ملک کے باشندوں کا نامہذب ہونا ہوتا ہے جبکہ جیسے کہ انگلستان، فرانس، جرمن، امریکہ وغیرہ کا شمار مہذب مما لک میں کیا جاتا ہے تو اسکا مطلب ہوتا ہے کہ ان مما لک کے باشندے تعلیم سے آراستہ اور تہذیب والے ہیں۔ ہندوستان کا شمار نا مہذب یا پھر نیم وحشی مما لک میں کیا جاتا ہے اور اسی وجہ سے ہندوستان کے باشندوں کو نامہذب اور نیم وحشی بتایا جاتا ہے۔

مگر قابل غور بات یہ ہے کہ حکومت کا نا مہذب ہونا کیا چیز ہے اور مسلمانی حکومتیں جس قدر ہیں ان کے مہذب ہونے کی وجوہات کیا ہوتی ہیں۔

اس مضمون میں بتایا گیا ہے کہ جن لوگوں پر وہ حکومت کرتی ہے ان کے حقوق کی۔ مال و جائیداد کی اور دیگر حقوق کے لئے تحفظ فراہم کرنے کی روادار ہوتی ہے۔

نہ صرف عام آدمی بلکہ حکومت کو بھی ان قوانین کے تابع ہونا چاہے اور سب کے حقوق مساوی ہونا چاہے جن حکومت میں یہ سب چیزیں نہیں پائی جاتی وہ حکومت نامہذب کہلاتی ہے اور ملک میں ان نہیں رہتا اور نہ ہی قوم کی ملک کی ترقی ہو پاتی ہے۔

اس مضمون کے مطابق کوئی مسلمانی سلطنت اس وقت دنیا میں ایسی موجود نہیں ہے جس پر مذہب گورنمنٹ کا اطلاق ہو۔ یا وہاں پر کی رعایا حالت سکون اور ترقی یافتہ ہو۔ کچھ حکومتیں یہ عقیدہ رکھتی ہیں کہ کوئی دنیوی کام بغیر مذہبی سند کے یا مذہبی اجازت کے نہیں کیا جاسکتا ہے اور جس طریقہ پر کوئی دنیوی کام پہلے ہو چکا ہے اُس سے مختلف طریقہ پر کوئی دنیوی کام نہیں ہوسکتا۔

سر سید احمد خان نے اس مضمون میں چند ایسے مما لک کا بھی ذکر کیا ہے جہاں دینی و دنیوی دونوں قسم کے کاموں کو مذہب میں شامل سمجھا گیا ہے۔ ان مما لک میں روم، ایران، افغانستان، ترکستان، ہندوستان کی مسلمان ریاستیں شامل ہیں۔ سر سید احمد خان مزید لکھتے ہیں کہ دنیا میں دو قسم کے امور ہیں ایک روحانی اور دوسرا جسمانی یا پھر ایک دینی ہے دوسرا دنیاوی ہاں کچھ معظم باتوں کو جنکا اثر اخلاق پر مبنی ہے۔ وہ دنیاوی ہوں بیان کر دیتا ہے۔ جیسا کہ اسلام ایک سچا مذہب ہے اور مذکورہ بالا اصول پر مبنی ہے۔ مضمون کے مطابق کچھ عالموں کا ماننا ہے کہ جہاں تک ہو۔ ہر کام کسی مذہبی سند پر کیا جائے۔ میں وہ کسی واقعہ کوئی مذہبی سند سے متعلق کرتے یا کسی اصول عام کو جوانکی قائم کی ہوئی ہوتی تابع کر دیتے تھے۔

اُس زمانے میں تمام افراد علماء کے اقوال اور استدلال کو ایک رائے سے زیادہ رتبہ نہیں دیتے تھے تاہم رفتہ رفتہ ان علماء کے اقوال بطور سند تصور ہونے لگے تھے اور اُسے ہی مذہب اسلام سمجھ لیا گیا۔ ان اقوال کو شروع کا نام دیا گیا اور ان میں موجود نقائص کو اسلام کے نقائص سمجھا گیا حالانکہ اسلام اُس سے بالکل بری ہے۔

علماء کے اختیار کیے گئے طریقے کچھ فائدہ مند ثابت ہوئے اور کچھ نقصاندہ رہے۔ اوران نقصانوں نے کل سلطنت اسلامیہ کو ڈبو دیا ہے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

مضمون: ہندوستان اور انگلش گورنمنٹ (ص:14)

سرسید احمد خان اس مضمون میں غدر 1857ء کی مصیبت کے بعد یہ سمجھا جانے لگا کہ ہندوستان میں تہذیب کی کمی واقع ہوئی ہے۔ اور تعلیم کی کمی سے آپس میں حاکم ومحکوم میں ارتباط بھی کم ہوا ہے۔ اس دوران ہندوستانی عوام کو انگریزی تعلیم فراہم کرنے کے بعد مقصد سے کچھ یونیورسٹیاں قائم کی گئی تھیں۔ بہت سے مدیران ملک ہندوستانیوں کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم دینا چاہتے تھے اور کچھ ناپسند کرتے تھے اور گورنمنٹ کا فرض قرار دیتے تھے مگر اس بات پر کسی کا خیال نہ تھا کہ تعلیم کے ساتھ تربیت کا ہونا لازم ہے۔ کیوں کہ صرف تعلیم سے آدمی آدمی نہیں بنتا اور اسکے اخلاق درست نہیں ہوتے۔ شمالی ہندوستان کے باشندوں سے عام طور پر تمام ہندوستان میں مسلمان قوم نے اس سے فائدہ حاصل نہیں کیا۔ بعد میں مسلمانوں نے اب اس سے فائدہ اٹھانا شروع کیا۔

وہ مزید لکھتے ہیں کہ اسوقت کی جو تعلیم ہندو، بنگالیوں، ممبئی کے پارسیوں، برہمنوں اور مرہٹوں کو دی گئی وہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم کہلائی ہے اور اس سے ہندوستان کے حق میں کوئی اچھا پھل ہاتھ نہیں لگا پھر یوں ہوا کہ انگلش گورنمنٹ جس طرح یورپ میں حکومت کرتی ہے اسی طرح ہندوستان میں حکومت کرے اور گورے کالے فاتح مفتوح میں فرق نہ سمجھے اور پھر لفظ آزادی سیکھا گیا اور اسکے معنی یہ سمجھے گئے کہ جو کچھ زبان یا خیال سے گزرے جائے وہ آزادی ہے اور پھر لفظ ایجی ٹیشن سیکھا گیا اور اسکی مثال آئرلینڈ میں حکومتوں کی تجویزوں پر کیے گئے اجتماع سے دی گئی۔

رفتہ رفتہ انکے خیال میں یہ بات آئی کہ انگریزی حکومت اسی قسم کی حکومت ہے جو علم ایجی

ٹیشن سے ڈرتی ہے۔اس مضمون کے مطابق جب تک گورنمنٹ کی برائیاں صحیح یا غلط، واجب یا نا واجب عام لوگوں میں نہ پھیلائی جائے اسوقت تک گورنمنٹ کے عام Agitation کی بنیاد قائم بھی نہیں ہوسکتی، اسی خیال پر نیشنل کانگریس کا وجود ہوا۔اور برٹش گورنمنٹ کی صورت کو ایک خود غرض گورنمنٹ اور ہندوستان کو لوٹنے والی گورنمنٹ بنا کر لوگوں کو دکھایا اور اپنے گروہ کو تعلیم یافتہ گروہ قرار دیا۔

سر سید احمد خان نے اپنے مضمون میں لکھا کہ ہم اس بات کے قائل نہیں کہ ایجی ٹیٹنشن کرنے والوں کا جو گروہ ہے اسکی نیت حکومت سے بغاوت کرنا یا لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کرنا ہے۔ پھر تمام یا تقریباً اخباروں کی ٹرن بدلی ہوئی پائی گئی۔مسلمان سوائے بعض کے اب تک نیشنل کانگریس اور اسکے ایجی ٹیٹنشن میں شامل نہیں ہوئے اور جو شامل ہوئے انہوں نے نہیں سمجھا کہ اس سے قوم کو اور ملک کو کیا نقصان پہونچتا ہے اور آئندہ پہونچے گا۔

اگر چہ مسلمان نیشنل کانگریس کے Agitation میں شریک نہیں ہوئے لیکن اکثر ان اخباروں سے بھی سوائے بعض کے جو مسلمان ایڈیٹروں کے ہاتھ میں ہیں اخباروں کی دیکھا دیکھی اپنے جامد سے قدم باہر رکھ کر مضامین کی تحریر کرنے لگے تھے اور انکے قلم پر کوئی روک نہیں رہی تھی تاہم یہ بات قابل افسوس تھی کہ ہندوستان کے تمام مسلمانان ہند و نیشنل کانگریس کے ساتھ مل کر انگریزوں کو نقصان نہیں کر سکتے تھے۔کون کہہ سکتا ہے کہ غدر 1857ء کے بعد جو حکومت نے تمام ہندوستان کے ہتھیار چھین لئے تھے اس میں گورنمنٹ کا قصور نہیں۔ بلکہ ہندوستانیوں کے اعمال کی سزا ہے انہوں نے 1857ء کے غدر میں کئے تھے۔اس دوران زمانہ ترکی کی فتح یابی پر ہندوستان میں جلسے ہوئے اور جشن منایا گیا۔مگر حکومت نے اسکو ناپسند کرنے کے باوجود کچھ مواخذہ نہیں کیا۔

اس مضمون کے مطابق تمام ہندوستان کے باشندوں کی اور بالخصوص مسلمانوں کی غیر عافیت اسی میں ہے کہ سیدھی طرح انگلش گورنمنٹ کے سایہ عاطفت میں اپنی زندگی بسر کریں اور خوب سمجھ لیں کہ مذہب اسلام کی یہی ہدایت ہے کہ جنکی ہم رغبت ہو کر رہتے ہیں انکے ساتھ وفادار رہیں اور انکو دنیاوی شہنشاہ جبکہ خداوند تعالیٰ کو مالک حقیقی سمجھتے رہیں۔

سعدیؒ نے بوستان میں لکھا ہے۔

شعر:

سزدگر بدوش بنام چناں کہ سیدھ بدوران نوشیروان

جسکا مطلب ہے کہ رسول خداﷺ خدا کا شکر فرماتے کہ وہ سلطان عادل ۔۔نوشیروان کے عہد میں پیدا ہوئے۔ جو کہ آتش پرست تھا۔ اسکے زمانے میں پیدا ہو کر رسولﷺ خدا کا شکر ادا کر سکتے ہیں تو ہم کو ایسے بادشاہ کی رعیت ہونے سے جس نے مذہبی آزادی دی شکر گزار ہونا چاہیئے۔

مضمون: امپریس اور وائسرائے (ص:21)

سر سید احمد خان اپنے مضمون میں کہتے ہیں کہ ملکہ معظّمہ گریٹ برٹن جو کہ آئر لینڈ اور اب ہندوستان کی ملکہ ہیں۔ empress کی حیثیت سے ملکہ ممدوحہ پر بلحاظ اس حلف کے جو تخت نشینی کے دن اٹھایا تھا۔ کوئی ناانصافی نہیں کر سکتی اور ہندوستان میں حکومت کے دوران بھی اُنہوں نے کوئی حلف نہیں لیا تھا اور نہ ہی مغلیہ کے بادشاہاں نے کوئی حلف اُٹھایا تھا مگر ایسے حلف کے ہونے یا نہ ہونے سے ہندوستان کی امپریس اور برطانیہ کے کوئین ہونے کی حیثیت سے انکے رتبہ میں کوئی فرق نہیں آسکتا بلکہ وہ برطانیہ کی طرح ہندوستان میں بھی انہیں قوانین وضوابط کے مطابق

حکمرانی کیا کریں گی جن کے بموجب وہ حکمرانی کرتی آئی ہے۔اس مضمون میں وہ لکھتے ہیں کچھ ہندوستان حکمرانی امپریس آف انڈیا کے اختیارات کے سامنے صاحب وائسرائے بہادر کو اختیارات حاصل نہ ہونے کی توقع کرنے لگے تھےاور یہ سمجھتے تھے کہ امپریس اس نئے خطاب کے لئے ایک نئی عدالت اپیل کے اختیارات عمل میں لائیں گی مگر یہ واضح رہے کہ خطاب کی تبدیلی سے حضور ملکہ معظّمہ کا رتبہ کسی طرح تبدیل نہیں ہوسکتا اور نہ ہی صاحب وائسرائے بہادر کے اختیارات کم نہیں ہوسکتے اور نہ ہی ان میں کچھ تبدیلی ہوسکتی ہے۔

اس مضمون کے مطابق پارلیمنٹ کو سب سے زیادہ اختیار حاصل ہوگا جیسا کہ سابق میں حاصل تھااور بغیر اسکی مرضی کے ملکہ معظّمہ امپریس کا خطاب بھی اختیار نہیں کرسکتی تھیں۔وائسرائے اور ملکہ پارلیمنٹ کے وزیروں کی مرضی کے اس سے بھی زیادہ تابع ہیں۔اسکا مطلب یہ ہوا کہ پارلیمنٹ کی مرضی کے اس سے بھی زیادہ تابع ہیں۔یعنی پارلیمنٹ کی عام منظوری کے تعبیر کوئی وائسرائے ہندوستان میں عرصہ دراز تک اپنے عہدہ پر نہیں رہ سکتا اور ضرورت پڑنے پر ملکہ کے وزراء وائسرائے کی واپس طلب کرسکتے ہیں۔

وزراء کے لئے پارلیمنٹ کی منظوری حاصل کرنا لازمی قرار پایا تھااور جب تک سلطنت کے وزراء کو پارلیمنٹ پر اعتماد ہوگا اسوقت تک ملک سے کوئی عرضی یا اپیل یا شکایت وہ وائسرائے کی معرفت نہ بھیجی جائے۔ اس مضمون میں اس بات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ ہندوستان کے مغلیہ حکومت سلطنت برطانیہ کے قبضہ میں جانے کے بعد حکومت خودرائے نہیں رہی تھی سلطنت مغلیہ کے بادشاہ خودمختار ہوتے تھےاور کسی کے جواب دہ نہیں ہوئے تھےاور پارلیمنٹ جیسا جلسہ بھی نہیں ہوتا تھا۔بس دربار لگتا تھا جس میں امرائے اور وزراء بادشاہ کی مرضی کے مطابق عمل کرتے تھے۔کوئی شخص اپنی رائے کو ظاہر کرنے کی جرأت نہیں رکھتا تھااور خاص بات یہ بھی تھی

کہ سلطنت مغلیہ میں مذہب اسلام کے سبب بادشاہ اپنی ذمہ داریوں کے پابند تھے جیسے کہ ترک اورافغان عہد میں ہوا کرتے تھے۔

مغلیہ سلطنت میں علماء کو اختیارات حاصل نہیں تھے جبکہ ملکہ الزبیتھ کے عہد میں رومن کیتھولک کچھ اختیارات رکھتے تھے۔عوام کی رائے کی وقعت نہیں تھی نہ ہی پارلیمنٹ کا اختیار تھا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مغلیہ سلطنت اور انگریزی حکومت خودمختار تھی مگر انگریزی حکومت میں باشندوں کی رائے کچھ اہمیت رکھتی تھی ۔ ہندوستان کے باشندے اسکے برعکس نہ کوئی مخالف رائے ظاہر کرتے تھے اور نہ ہی اعتراضات کرتے تھے۔

مگر رفتہ رفتہ انگریز دور حکومت میں لوگ اپنی رائے ظاہر کرنے لگے جو کہ ہندوستان کی حکومت میں نہیں کر سکتے تھے۔ ہندوستانیوں کے واسطے یہ بات نہایت خوشی کی رہی کہ وہ انگریزوں کو پیدائش سے حاصل حق میں رفتہ رفتہ شریک ہوتے رہے اور خودمختار حکومت کے غلام نہیں رہے تھے بلکہ ایسی حکومت کی رعایا میں شامل ہو گئے تھے جو قوانین کی پابند ہے اور جسکے عہد میں ان کی خواہشیں اور حاجتیں عوام کے روبرو نہیں کی جاتی ہیں اور ان پر توجہ دی جاتی ہے۔

مضمون: بعض سرکاری انتظاموں سے رعایا کیوں متنفر ہے (ص:28)

اس مضمون میں سرسید نے کہا ہے کہ ہندوستانی حکومت نے صرف نفع رسانی مخلوق کے بہت سے ایسے انتظام کر رکھے ہیں۔ اگر انکے اصل منشاء کے موافق رعایا کو فائدہ پہونچایا جاتا تو اسکا فائدہ بے انتہاہ ہوتا اور اسکے لحاظ سے رعایا پر بے انتہا شکر گزاری لازم ہو۔مگر افسوس ہے کہ ایسے بے نظیر اور عمدہ انتظاموں کو ہندوستان کی اکثر رعایا نہایت ناپسند کرتی ہے۔اور اسکا نفراس حد تک بڑھ جاتا ہے کہ اگر اس پر تشدد کیا جائے تو رعایا اسکو ایسا سلوک سمجھتی ہے۔شفاخانوں کا جاری

کرنا ایک ایسا نظام ہے جو سراسر رعایا کی بہبودی کا سامان ہے اور اگر رعایا اُس سے حسب منشا گورنمنٹ سے فائدہ حاصل کرنے کا قصد کرے تو اس میں بہت کچھ فائدہ رعایا کا منصور ہے۔ ہندوستانی رعایا سرکار شفا خانوں سے نہایت مستفر رہتی ہے اور اگر بعض اوقات شفا خانے کے علاج پر رعایا کو مجبور کرنے پر اس علاج کو موت سے کچھ کم نہیں سمجھتی۔

پس اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اسکا سبب کیا ہے اور ہندوستان کی رعایا کیوں ایسی وحشیانہ حالت میں ہے کہ گورنمنٹ کے مشفقانہ انتظامات سے سے بھی وہ رنجیدہ رہتی ہے۔ یہ بھی جاننے کی ضرورت ہے کہ اسکا سبب صرف رعایا یا صرف حکومت ہی کی طرف سے نہیں ہے بلکہ طرفین سے ہے اور ہر ایک ایک کا ایک سبب ہے۔ جو سبب رعایا کی طرف سے پیدا ہوا ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ بلاشبہ ہندوستان کی رعایا اپنے جہل کی سبب سے کسی مفید بات کی حقیقت کو نہیں دریافت کرسکتی۔

وہ مزید لکھتے ہیں کہ سرکاری تدابیر سے فائدہ حاصل نہ کرنے کے ان اسباب بیان کئے جو خاص رعایا کی طرف سے پیدا ہوئے تھے اب تاہم کچھ اسباب ایسے بھی ہیں جو خاص انتظام کے متعلق پیدا ہوتے ہیں۔جن میں ملازموں کی کج اخلاقی اور ظلم و زیادتی اور اگر سچ کہیں تو بعض اوقات انکی بدمعاشی اس بات کا باعث ہے کہ ہندوستان انکی صورت دیکھنے اوران کے پاس جانے سے اپنا مرنا بہتر سمجھتے ہیں ہندوستان کی قوم بہت زیادہ عادی، نرمی اور خوشی اخلاقی کی ہے اور یہ بات سرکاری سررشتوں میں نام کو بھی نہیں ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انگریزی بڑے ڈاکٹر ہوتے ہیں وہ تو ہرگز غریب رعایا کا علاج کرنا پسند نہیں کرتے اور وہ مجبور ہیں کہ کسی کے ساتھ خوش اخلاقی نہیں کر سکتے کیونکہ بداخلاقی اس قدر انکی جبلت میں بیٹھ گئی ہے کہ اب خوش اخلاقی کو وہ بہ تصنع کرنا چاہتے ہیں اور نہیں ہوسکتی۔

سرسید احمد خان لکھتے ہیں کہ سرکاری شفاخانوں کی تعمیر کے باوجود ہندوستانی عوام اس سے استفادہ حاصل نہیں کر سکتے ہیں۔

ایسے مفید محکمہ کو اس قدر مصیبت کا باعث سمجھتی ہے کہ اسکا کچھ بیان نہیں ہوسکتا اور اسکے حکام اور اسکی تعمیلوں سے یہاں تک گھبرائی ہوئی ہے کہ کچھ اس کی انتہا نہیں ہے مگر چوں کہ ہمارے اس پرچہ میں اب گنجائش نہیں ہے اور اسکے متعلق خرابیوں کی تفصیل زیادہ طوالت کو متقفی ہے اس جہت سے ہم اس موقع پر اسکو فروگذاشت کرتے ہیں۔

مضمون: خطاب شہنشاہی (ص:38)

سرسید احمد خان اس مضمون میں لکھتے ہیں کہ خطاب شہنشاہی کو لے کر انگلستان کی پارلیمنٹ میں کافی دنوں تک بحث کی جارہی تھی اور ممبران پارلیمنٹ لطف آمیز تقریریں کررہے تھے اور اسکا موضوع تھا کہ ملکہ کا خطاب شہنشاہی ہونا چاہیے یا نہیں! کچھ مضبوطی سے اس بات کی تائید کررہے تھے۔ملکہ کو شہنشاہی کا خطاب ملنا چاہئے جبکہ کچھ مخالفین اسکی مخالفت کررہے تھے اور خطاب کو ناپسند کررہے تھے۔

سرسید احمد خان مزید لکھتے ہیں کہ مخالفین اور حمایتوں کی جانب سے جو وجوہات پیش کی گئی وہ مناسب ہیں نہیں اس پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ جب مخالفین کی جانب سے دیئے گئے وجوہات پر نظر ثانی کی تو یہ واضح ہوا ہے کہ یہ وجوہات قابل تسلیم نہیں ہے۔ کیونکہ ہندوستان کسی بھی ملک سے کم تر نہیں اور نہ ہی خطاب شہنشاہی کا مطلب خودمختاری ہے اور ملکہ اس خطاب کی مستحق ہیں۔

اس مضمون میں وہ کہتے ہیں کہ ملکہ کوتمام ادیان کی حفاظت بخوبی کرسکتی ہے اور اپنی حکمرانی میں اس بات کی کا خاص خیال رکھتی ہیں کہ مذہب میں کسی طرح کا کسی کے ساتھ اختلاف نہ کیا جائے لہٰذا حادی ادیان کہا جانے میں ملکہ کے خطاب کی خاص عزت کوظاہر کرنے میں کوئی دقت نہیں ہے۔

جس ملک کے حساب سے ملکہ کوشہنشاہی کا خطاب دیا جاتا ہے اس ملک کے باشندے ملکہ کے مشکور ہوئے ہیں اور جولوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شہنشاہ کے لفظ سے غرور ثابت ہوتا ہے وہ غلط ہیں اور یہ خیال کرنا کہ جابر بادشاہ کے لئے یہ لفظ استعمال ہوا ہے یہ بھی غلط ہے اگر شہنشاہ کے معنی جابر کے ہوتو اعتراض کیا جاسکتا ہے۔

ہندوستان کی عوام نے ملکہ کوشہنشاہ کے خطاب سے مخاطب کرنے پر نہایت خوشی کا اظہار کیا ہے۔ یہ چھٹی انہوں نے ہندوستان کے نام لکھی تھی انہوں نے اپنی چھٹی میں عیسائی مذہب کی خصوصیات بیان کی ہیں اور اس مذہب کو ماننے والی قوموں کوشائستہ قرار دیا ہے انہوں نے مذہب کی تائید میں کئی دلیلیں بھی پیش کی ہے۔

مصنف سر سید احمد خان لکھتے ہیں کہ ایڈمنڈ نے حضرت عیسیٰؑ کی تاریخ پیدائش اور حیات مبارک و مذہبی دعوت معجزوں کا اپنی چھٹی میں ذکر کیا ہے۔ اور ان تمام واقعات کوتسلیم کریں جو حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ رونما ہوئے تھے اور انہوں نے انجیل پر ایمان لانے کی دعوت بھی دی تھی۔

مضمون: البرٹ بل (ص:44)

سر سید احمد خان نے اس مضمون میں لکھا ہے کہ کونسل گورنر جنرل آف انڈیا نے فوجداری کی دفعات کی ترمیم میں ایک بل کونسل میں پیش کیا گیا تھا جسکا مقصد مجموعہ ضابطہ فوجداری کی دفعہ

22 کی ترمیم ہوئی ہےاور ایسا حاکم جو یورپین کی نسبت مقدمات فوجداری کو سماعت کرے مقرر نہیں ہوسکتا تھا اور یہ بل ہندوستانیوں کو یہ اختیار دلا سکتا تھا۔

اگر مذکورہ بل پاس کر دیا جاتا تو بعض ہندوستانی حکام کو یورپین صاحبان رعیت برطانیہ کی نسبت بھی مقدمات فوجداری کی سماعت کا اختیار حاصل ہوجائے گا۔

کچھ یورپ کے باشندوں نے جو ہندوستان میں رہ کر تجارت اور کاروبار کررہے تھے اس بل پر اعتراض کیا اور مجلس مقرر کرتے ہوئے اسکے برخلاف رائے قائم کی۔ اور اس بل پر ان کا شدید اعتراض نظر آیا۔ اسکے برخلاف ہندوستانیوں نے نہ ان مجالس میں حصہ لیا تھا اور نہ ہی اس پر اعتراض کیا تھا۔

سر سید احمد خان لکھتے ہیں کہ البرٹ کے بل سے گورنمنٹ کے قانون میں نقصان ہونا وہ بات قابل تشویش نہیں ہے۔ بلکہ جو وعدہ ملکہ ہند نے کیا تھا کہ تمام رعایا کو برابری کا حقوق ملے گا اُسکی تکمیل باعث مسرت ہے۔ اور ہندوستانیوں کے لئے نہ ہی یوروپین افراد کی کاروائی کے خلاف کاروائی کی ضرورت ہے اور نہ ہی انہیں اس سلسلہ میں کوئی خیال آیا تھا۔

وہ لکھتے ہیں کہ بل کے پاس ہونے یا نہ ہونے سے زیادہ خوشی کی بات یہ رہی کہ حکومت ہند حکومت انگلینڈ اور پارلیمنٹ یوروپی شہریوں کی سوچ سے واقف ہوچکی تھی اور ہندوستانیوں کی شکایت کا بھی انہیں بخوبی اندازہ ہوا تھا۔

سر سید احمد خان کا خیال ہے کہ ایک قوم کا دوسری قوم کے ساتھ اچھی یا بری feeling ہونا یہ نہ ہونا صرف قانون پر منحصر ہے جب قانون میں ایکتائی نہ ہوئی تو ایک قوم دوسرے قوم کے لئے کبھی اچھی feeling نہیں رکھ سکتی۔ ہندوستانیوں اور انگریزوں میں اصلی محبت قانون کے برابر ہونے پر ہی ممکن ہے۔

مضمون: کیا سب ہوا ہندوستان کی سرکشی کا؟ (ص:48)

اس مضمون میں ہندوستان کی سرکشی اور بغاوت کے وجوہات کو بیان کیا گیا ہے۔ مصنف کے مطابق 1857ء میں مسلمانوں کو مشکل مسائل کا سامنا رہا ہزاروں افراد مارے گئے، سینکڑوں مسلم خاندان تباہ ہو گئے اور جاگیریں تک ضبط کر لی گئیں۔ غرض کے مسلمانوں کو انگریزوں کے غصے کا سامنا رہا اور مسلمانوں کی ہمدردی و تائید کرنے والے بھی سزا کے مرتکب ہوئے۔ جبکہ مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنے والے انعامات کے حقدار بنے۔

1857ء میں ہوئی سرکشی کے بے شمار وجوہات کو سرسید احمد خان نے بے باک انداز میں بیان کیا تھا۔ اتنا ہی نہیں انہوں نے اپنے دلیرانہ مضمون کو انگلستان بھی روانہ کیا تھا جسکے بعد انگریزوں کا غصہ بھڑک اٹھا تھا اور انہیں سزا دینے کی مانگ کی جارہی ہے۔ مگر کچھ ممبران پارلیمنٹ سرسید احمد خان کی تائید کی۔ سرکشی اور بغاوت کے اسباب مدتوں سے لوگوں کے دلوں میں جمع ہوگئی بہت سی باتیں تھی جس میں فوج کی بغاوت نے آگ لگا دی تھی۔

سرکشی کا ہونا 5 اصولوں پر منحصر تھا جن میں غلط فہمی۔

- ☆ ہندوستان کی حکومت اور ہندوستانیوں کی عادات کے
- ☆ مطابق آئین اور ضوابط کا جاری نہ کرنا۔
- ☆ رعایا کے اصلی حالات سے ناواقف رہنا۔
- ☆ ہندوستان کی حکومت کے لئے لازم امور کا ترک ہونا اور
- ☆ فوج کی بدانتظامی اور بے اہتمامی شامل ہے۔

ان 5 وجوہات کے باعث ہندوستان میں بغاوت پھوٹ پڑی تھی۔

مصنف لکھتے ہیں کہ غصہ معاملات کی اصلیت کو چھپا دیتا ہے۔اور طبیعت سیاست کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔اور یہی وجہ ہندوستان میں سرکشی کا سبب بنی تھی۔

سرسید اس مضمون میں پادری ایڈمنڈ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ پادری نے ایک ہی مذہب اختیار کرنے سے متعلق غور کرنے کی بات کہی۔

مضمون: ڈاکٹر ہنٹر کی غلط فہمیوں کا ازالہ (ص:125)

سرسید احمد خان نے اپنے اس مضمون میں ایک سرکاری افسر ولیم ہنٹر کی کتاب Our India Musalman کا ذکر کیا ہے۔اس کتاب میں ہنٹر نے جو کچھ لکھا اس کا مقصد صرف اور صرف انگریز حکمرانوں کے دل میں مسلمانوں کے خلاف نفرت اور حقارت پیدا کرنا تھا۔

اس کتاب کا معقول جواب دینے کے لئے سرسید احمد خان نے ایک مقالہ لکھ کر شائع کروایا تھا۔جس سے انگریزوں کا غصہ اور تعصب مسلمانوں کے برخلاف بہت کم ہوا تھا۔اور ہندوستانی ہونے کے ناطے سرسید احمد خان نے ہندوستانیوں کی تائید میں آواز اُٹھائی تھی اور اپنے مقالہ کے ذریعہ ڈاکٹر ہنٹر کی بات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔

اس مضمون میں سرسید احمد خان کے لکھے گئے مقالے کی تمام تفصیلات کا ذکر کیا گیا ہے۔جو کہ تفصیلی ہے اور مختلف موضوعات پر مبنی ہے جن میں وہابیوں کے باغی لشکر قائم ہونے کی کیفیت بھی شامل ہے۔

اپنے مضمون کے ذریعہ سرسید احمد خان نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسلمانان ہند انگریزی حکومت کے ہرگز مخالفانہ نہ تھے اور نہ ہی انہوں نے جہاد کا اعلان کیا تھا۔

اس مضمون کا مطالبہ کرنے پر یہ انکشاف ہوا ہے کہ ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی کتاب کے ذریعہ مسلمانوں کے خلاف غلط رائے قائم کرتے ہوئے زہرافشانی کی تھی جسکا سرسید احمد خان کو بہت افسوس تھااورانہوں نے انکی کتاب کے موضوعات پراپنا بھرپور ردعمل ظاہر کیا تھا۔اورانکے غلطیوں کی تردید کی تھی۔

سرسید احمد خان نے غلطیوں کی جس بے باک انداز میں تحریر کی تھی وہ قابل ستائش ہے اور انہوں نے انگریزی حکومت سے بھی یہ توقع رکھی تھی کہ وہ مسلمانوں کے دل میں انگریزوں کے خلاف موجودنفرت کورفع کرےاوردلوں میں اعتبار پیدا کرنے کی کوشش کرے ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب اورسرسید احمد خان کی جانب سے لکھے گئے مضامین سے یہ ظاہر ہوا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے خلاف رچی گئی سازش جہاں سب خون ودہشت کے مارے خاموش تھے وہیں سرسید احمد خان نے نہایت ہی ہمت اور دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہنٹر کی غلطیوں کا ازالہ کردیا تھا۔اور مسلمانوں کوراحت پہونچائی تھی۔

مضمون:انڈین آبزروراورمسلمان(ص:208)

مندرجہ بالا مضمون میں سرسید احمد خان نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کی جوحالت تھی اور جوالفاظ اوررائے کا استعمال کیا گیا تھا وہ بالکل درست تھا انکا ماننا ہے کہ Indian آبزرور میں آرٹیکل لکھے تھے وہ ناراض ہونے والے نہیں تھے بلکہ ان الفاظ اورتحریروں سے یہ توقع تھی کہ شاید قوم کی غیریت جاگ جائے اوروہ اپنی اصلاح پرتوجہ دیں۔

انڈین آبزرور کے آرٹیکل کا ذکر کرتے ہوئے سرسید احمد خان کہتے ہیں کے ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا اثر نہ ہونے کے پس منظر میں آرٹیکل میں مسلمانوں کوسور کا خطاب دیا تھا اور

سر سید احمد خان اس سے متعلق لکھتے ہیں یا تو مسلمانوں کو اسی خطاب میں خوش رہنا چاہئے یا پھر اپنی حالت کو درست کرتے ہوئے یہ بتلانا چاہئے کہ خطاب کا اصل حقدار کون ہے۔

مسلمان قوم کو آرٹیکل لکھنے والے نے سنگریزہ اور کنکر کی مانند قرار دیا جس پر سر سید نے سوال کیا ہے کہ کیا قوم کو سنگریزوں اور کنکروں میں پڑا رہنا پسند ہے یا پھر ترقی کرنے کا ارادہ ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے جن الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے وہ الفاظ لکھنے والے شخص کی بد زبانی کو ظاہر کرتا ہے مگر بجائے ان باتوں کا خیال کرنے کے دشمن کے الفاظ سے نصیحت حاصل کر کے سبق حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

آرٹیکل لکھنے والے نے کمیٹی سے مسلمانوں میں کوئی بڑا فلسفی یا شاعر پیدا ہونے سے متعلق شبہ ظاہر کیا ہے جس کے جواب میں سر سید احمد خان لکھتے ہیں کہ آرٹیکل لکھنے والے شخص کو کیمبرج یونیورسٹی جا کر ہسٹری آف فلاسفی اور ہسٹری آف Oriental لٹریچر پڑھنے کی ضرورت ہے۔ تبھی اسکے شبہات دور ہو سکیں گے۔

مضمون: وہابی، اہل حدیث یا متبع حدیث (ص:210)

اس مضمون میں کسی کو برے نام سے پکارنے پر ہونے والی دقتوں اور تکالیف کو بیان کیا گیا ہے۔ سر سید احمد خان لکھتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے جو متبع سنت تھے بطور حقارت کے انکا نام وہابی رکھا تھا اور مولوی ابو سعید محمد حسین کو وہابی نام سے پکارا جانا ناگوار گزرتا تھا لہٰذا انہوں نے حکومت سے درخواست کی تھی کہ لوگوں کی جانب سے اہل حدیث فرقے کو دیئے گئے وہابی نام سے مخاطب نہ کیا جائے۔ اور انکے اس نام کو گوارا نہ کرنے کی معقول وجہ بھی تھی کہ وہابی کو مخالف سلطنت سمجھا جاتا تھا مگر یہ خیال نہایت ہی غلط تھا کیونکہ سر سید احمد خان کو امید تھی کہ وہابی فرقہ اپنے عقائد مسائل

مذہب میں نہایت سخت اور پختہ ہیں اور جس سلطنت میں وہ رہتے ہیں کبھی اُس سلطنت سے مخالفت نہیں کر سکتے ہیں۔

خواہ وہ عیسائیوں کی ہو یا یہودیوں کی یا بت پرستوں سرسید احمد خان مزید لکھتے ہیں کہ مذہبی آزادی دستیاب نہ ہونے پر وہابی فرقہ کا سلطنت سے ہجرت کرنا لازمی ہوتا تھا مگر وہ مخالفت نہیں کرتے تھے اور انگلش گورنمنٹ کے لئے وہابی فرقہ کے لئے ایک رحمت ہے کیونکہ اسلامی سلطنتوں میں بھی وہابیوں کو مذہبی آزادی ملنا دشوار ہی نہیں ناممکن ہے۔

سرسید احمد خان کا کہنا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین میں وہابیوں کے لئے دارالامن ہے اور وہ انگلش گورنمنٹ میں محفوظ ہیں۔ تمام مسلمانوں کو مولوی ابوسعید محمد حسین کا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت ہے کہ انکی کوششیں سے یہ خیال دور ہوا ہے اور انگلش حکومت بھی شکریہ کی حقدار ہے کیونکہ اس نے مولوی ابوسعید کی کوششوں کو منظور کیا۔

مضمون: زمانہ کی ترقی کا نشان (ص:213)

زمانہ کی ترقی کے نشان سے متعلق اس مضمون میں سرسید احمد خان لکھتے ہیں کہ زمانہ کی ترقی کے لئے دلوں میں موجود ناجائز خیالات اور باہمی مخالفت کے ختم کرنے کی ضرورت ہے اور اسکے ذریعہ قومی عزت کی حمایت کا خیال عام لوگوں کے دلوں میں پیدا کیا جاسکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ آہستہ آہستہ تعصّبات کم ہوتے جارہے ہیں۔ اور قومی عزت کے معنیٰ لوگ سمجھنے لگے ہیں۔ انہوں نے دوسری قوم کو اپنا بھائی کہہ کر تعلقات مضبوط کرنے کی بات بھی کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سلطنت ترکی اعانت کے لئے اہل سنت و جماعت فرقہ کی آمادگی کے بعد شیعہ حضرات نے سنیوں کے ساتھ ہمدردی کا مظاہرہ کیا اور ایسا لگتا تھا کہ ترقی کا زمانہ آگیا ہے۔ سنیوں اور شیعہ حضرات میں ایک خاص مذہبی معاملہ کی مخالفت ہو لیکن یہ مخالفت کچھ اتنی بھی شدید نہیں کہ مسلمانوں پر آئی

مصیبت کے بعد سنی وشیعہ علیحدہ ہوجائیں اور توہین گوارہ کریں۔ سرسید احمد خان نے کچھ ایسے افراد کے بارے میں بیان کیا ہے جو کہ شاہ ایران کو کربلا معالیٰ پر قبضہ کرنے کی رائے دے رہے تھے۔ مگر ایران کے شاہ نے جو کہ بے تعصب شخص تھے ترکی کے سلطان سے فوج کی مدد پہونچانے کا وعدہ کیا اور ایک مضمون میں تمام سنی اور شیعہ کو ایک ہی فرقہ کے دو گروہ قرار دے کر تمام مخالفت ختم کر دی۔ اس اعلان سے سنیوں کے دل میں ایران کی حکومت کے لئے بڑی عظمت اور وقعت پیدا ہوگئی۔

اس مضمون میں ہندوستانیوں کے تعصب سے اجتناب پر سرسید احمد خان نے خوشی کا اظہار کیا ہے اور ایک شیعہ مصنف کی جانب سے لکھے گئے رسالہ کو قومی تہذیب کی بنیاد ڈالنے کی شروعات قرار دیا ہے۔ ایران کے شاہ کے لکھے گئے اشتہار کا سرسید نے ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں اور دیگر طبقوں میں تھوڑا سا بھی فرق تفرقہ وجدائی کا باعث نہیں بن سکتا ہے۔ لہٰذا انہوں نے تمام اہل اسلام کو لحاظ مروت اور آئین اسلام کا خیال رکھنے اور ادب سے بزرگان دین و خلفائے راشدین کے نام لینے کے لئے کہا ہے۔ اور ایرانی شاہ نے نامناسب باتوں اور بیانات کے خلاف کاروائی کرنے کی ہدایت دی اور شیطانی وسوسہ والے کو سزائے کامل دیں تا کہ اسلامی بھائیوں میں رنج وعداوت پیدا نہ ہوسکے۔

مضمون: یورپ کی موجودہ حالت (ص:219)

سرسید احمد خان نے پائیر میں درج چھٹی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا یورپ کی حالت بیان کہی ہے وہ لکھتے ہیں کہ جرمن اور فرانس کی جنگ کے دوران انگلستان کی خاموشی کو بزدلی سمجھا گیا تھا۔ اور انگلستان اپنی بزدلی کے الزام کو ختم کرنے کی تاک میں تھا کچھ وزراء بھی رائے رکھتے تھے کہ روسیوں کو ختم کر کے انگلستان کی قوت ثابت کر دینی چاہئے اور ایسا کرنے سے انگلستان کی عزت مستحکم ہوجائے گی۔ روس کی خودمختارانہ کاروائیوں سے انگلستان کی شوکت میں خلل انداز تھیں اور

وہ بےخوف نظر آ رہا تھا کہ انگلستان اسکا کچھ بگاڑ نہیں سکے گا۔سر سید احمد خان نے اس مضمون میں کرسپانڈنٹ کی رائے کا تذکرہ کیا ہے کہ انگلستان نہ ٹرکی کا ساتھ دے کر روس سے لڑے گا اور اپنی فوج کے سپاہیوں کی قوت ظاہر کرنے کی ممکن کوششیں کرے گا اور انگلستان کی جانب سے مزید امن قائم رکھنے کی امید نہیں رکھی جا سکتی ہے۔

یورپ میں یہ بات بھی تسلیم کی جا چکی تھی کہ نا اہل گروہ کی غلطی سے 1845ء کی جنگ ہوئی تھی۔اور روس اگر جنگ کرنے کا ارادہ کرے گا تو انگلستان ترکی کے ساتھ ہو کر لڑے گا اس پر کونٹ شنو یلاف نے امن قائم رکھنے کی کوششیں کی مگر ناکام کوشش ثابت ہوئی۔

اس مضمون کے مطابق روس انگلستان کو تنہا اور کمزور سمجھنے کی غلطی کر رہا تھا مگر وہ نہ نہیں جانتا تھا کہ اگر انگلستان اور ترکی کی قوت مل جائے تو کوئی بھی دونوں کو ہرا نہیں سکتا۔

کرسپانڈنٹ Poineer نے یورپ میں امن قائم رہنے کی کوئی امید نہیں ہے اور ایسا بھی لگتا ہے کہ خواہ مخواہ جنگ نہیں ہوگی کیون کہ انگلستان کی جانب سے قصہ ظاہر کرنے پر روس نے درخواست کی تھی کہ ترکی کو عیسائی گورنر مقرر کئے جانے پر صلح کرنی چاہئے۔اتنا ہی نہیں روس کی جانب سے کئی شرائط رکھی گئی تھیں۔اور صلح کے خواہاں رومی وزیر ترکی کی بے عزتی نہیں چاہتے تھے۔ترک نہایت ہی شجاع اور بڑے بہادر نے اور بلا مدد اسکے روسیوں سے لڑنے کا حوصلہ رکھتے تھے اور عیسائی فوج کی مدد سے انکار کرتے تھے۔

مذکورہ کرسپانڈنٹ نے لکھا ہے کہ روسیوں کی حالت سے ترکیوں کی بے خوف فطرت کا اندازہ ہوتا ہے اور اگر ان کے ساتھ لڑائی کی جائے تو وہ آخری دم تک اُسے برداشت کریں گے۔

اس مضمون سے ترکیوں کی ہمت اور بلا خوف فطرت کی جھلک نمایاں ہوتی ہے اور ترکی انگلستان کا ساتھ دے گا تو پھر روس کی شکست یقینی ہے اور انگلستان بھی اپنے پر بزدلی کا الزام نہ لے کر یورپ میں اپنی قوت کو ظاہر کرے گا جس سے روس کے ارادوں مزاحمت ہو سکے گی۔

کتاب	مصنف/مرتب	حصہ دوازدھم	ناشر/مقام اشاعت	سن اشاعت
اردو کا کلاسی ادب مقالات سرسید	مولانا محمد اسماعیل پانی پتی	تقریری مقالات	مجلس ترقی ادب نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ لاہور	ندارد

ہمارے روسا اور قومی بھلائی (ص:3)

(اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ۔13 جولائی 1866ء)

سر سید احمد خان اپنے اس مقالے میں کہتے ہیں کہ دوسرے مما لک کی بہ نسبت ہندوستان میں ذی رتبہ اور باوقار آدمیوں کی نہایت تعظیم اور عزت کی جاتی ہے۔حد سے زیادہ ان کا اعتبار اور اعتماد ہوتا ہے۔خصوصاً اپنے لوگوں کا جو مذہبی کاموں میں مقتداء اور پیشوا گنے جاتے ہیں۔مثلاً برہمن یا مولوی۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اور کسی دوسرے ملک میں بے شمار آدمیوں کی طبعتیں ایسی جلد کسی کی طرف راغب اور اس کے قابو میں نہیں آجاتی ہے جیسے کہ ہندوستان میں ہوتا ہے۔نہ ہی دوسرے مما لک کے قوم ایسی جلد تربیت اور ہدایت قبول کرتے ہیں۔سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ ہماری خواہش نہیں ہے کہ ہمارا چال چلن ذرا بھی بدل جائے بلکہ بڑی آرزو یہ ہے کہ وہ بدستور قائم رہے۔کیونکہ اچھے اطوار اور اچھی تربیت ہر جگہ یکساں ہوتی ہے۔اسی وجہ سے اچھی تربیت اور تعلیم یافتہ لوگوں میں بلاشبہ وہ ارتباط اور ربط ضبط پایا جاتا ہے۔جو ایک قوم یا مذہب یا زبان کا شریف آدمی دوسری قوم یا مذہب کے آدمی سے فوراً پیدا کر لیتا ہے۔سر سید احمد خان اپنے مقالے میں اس بات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں کہ اچھے چال چلن کے برخلاف بعض رسمیں ایسی ہے جو غرور یا اعتقاد

باطل پر مبنی ہونے کی وجہ سے ناجائز اور مضر ہے۔ان رسموں کو گھٹانے اور مٹانے میں دولت منداور ذی وقار ہندوستانی شریف بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ان بری رسموں میں نہایت مشہور رسم بیوہ کے ستی ہونے اور بیمار کو دم واپسی دریائے کنارے لے جا کر زبردستی اُس کی جان نکالنا اور دختر کشی اور شادیوں میں بے جا اسراف کرنا اب بھی موجود ہے۔اس میں دختر کشی ایک ایسی خراب رسم ہے کہ انسان کے اچھے اخلاق کو فنا کر کے بداخلاقی پیدا نہیں کرتی بلکہ مخلوق کی ترقی کی بھی مانع ہے۔اودھ کے تعلقہ داروں اور راجپوتانہ کے راجاؤں نے اس کو رفع کرنے کی کوشش کی کس حد تک کامیاب بھی ہوئے لیکن جڑ سے ختم نہیں کر پائے۔سرسید احمد خان اس بات پر بھی روشنی ڈالتے ہے کہ ہندوستان کے دولت منداور ذی وقار شریف آدمی بھلائی پہونچانے میں اپنے رعب وادب کو بہت کچھ کام میں لا سکتے ہیں جیسے زمین کی مالیت بڑھانے میں کوشش کریں سرسید احمد خان اپنے مقالے میں ایک مثال پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کلکتہ کے رئیس پرستو گارٹا گور نے روپیہ خرچ کر کے اپنے علاقوں میں نہر کھدوائی ہے جس کے سبب ان کی سالانہ آمدنی بہت زیادہ ہوگئی ہے سر سید احمد خان زمینداروں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ وہ ہر کام میں گورنمنٹ کی امداد کی آرزو نہ کریں۔ہاں یہ سچ ہے کہ گورنمنٹ کو زمین کی مالیت کی ترقی سے ظاہراً فائدہ ہے۔بلکہ وہ خود بھی بہت بڑی زمین دار ہے اس لئے گورنمنٹ کو چاہئے کہ وہ کشت کاری کی ترقی میں مدد کرے۔مگر پھر بھی گورنمنٹ سے توقعات نہیں رکھنی چاہئے سرسید احمد خان دولت مند ہندوستانیوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اپنی قابلیت اور رعب داب کو اپنے نفع کی ترقی اور ملک کی تجارت بڑھانے میں کام میں لانا چاہئے۔سرسید احمد خان اپنے مقالے میں اس بات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں کہ جب تک علم نہ پھیلے گا تب تک انسانوں کے خیر خواہ لوگ جو جاں فشانی اور کوشش اپنے ملک کی بھلائی کے واسطے کریں گے وہ ان کو بے فائدہ معلوم ہوگی۔سرسید کہتے ہیں کہ لوگوں کا متفق ہونا بڑے کام کی چیز ہے۔نہایت قوی آدمی تنہا ہو تو بہت سے آدمیوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو کمزور پاتا

ہے۔اور جن کوخدا نے عزت وقار سے نوازا ہے وہ نہ صرف اپنے فائدوں پر اتفاق کریں بلکہ تعلیم اور نیک اخلاق کے اصولوں کو شائع کرنے میں بھی اتفاق کریں۔جن کے سبب ایک ملک قوموں میں امتیاز حاصل کرتا ہے۔سر سید احمد خان اپنے مقالے میں کہتے ہیں کہ دیسی زبان دیہاتوں میں رہنے والوں کو دی جائے۔جس میں صرف لکھنا پڑھنا اور حساب سکھایا جائے۔شہروں میں اسکول و کالج جن میں دیسی اور انگریزی دونوں زبانوں کی تعلیم دی جائے ۔اسکے علاوہ امیر اور بڑے آدمیوں اور عالم و فاضل کو چاہئے کہ اسوسی ایشن اور سوسائٹی اس غرض سے بنائیں کہ مفید علوم اور فنون کو ترقی اور عظمت بخشیں اور فیاضی کے کام کیا کریں۔سر سید احمد خان مقالے میں اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ تمام باتیں جو اوپر بیان کی گئی ہے ان باتوں میں بہت سی ترقی ہوگئی ہے۔چنانچہ دیہات میں دیسی زبانوں کی تعلیم و تربیت زور و شور سے کی جاتی ہے۔تمام ملک میں جسم کی درستی کے واسطے اکھاڑے موجود ہیں۔بڑے شہروں کلکتہ، لاہور، آگرہ، غازی پور وغیرہ میں بہت سے ایسے مدرسے اور کالج صرف ہندوستانی قائم کرتے ہیں۔اور بہت سارے اخبار جاری ہے۔جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہر قسم اور ہر استعداد کے لکھنے پڑھنے والے موجود ہے۔سر سید احمد خان مقالے کے آخر میں کہتے ہیں کہ بڑے درجہ کی روحانی اور مذہبی تعلیم کے واسطے مختلف مذہبوں کی حقیقت پر مباحثہ کرنے کے لئے اسوایشن یعنی جماعتیں مقرر کی جائے۔جیسا کہ ایشیاء کے باشندے ہمیشہ سے کرتے رہے ہیں۔مقدس اور معزز کتابوں پر غور اور تمیز سے بحث کی جائے۔غریب کے لئے اسپتال، خیرات خانے اور رفاہ عام کے واسطے سرائیں بنائی جائیں۔سر سید احمد خان اپنی گفتگو کو انگلستان کے ایک بڑے شاعر کے چند لفظوں پر ختم کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ

''تمام انسانوں کی غرض ثواب سے ہے گو وہ کسی ڈھب اور کسی طریقہ سے حاصل کیا جاوے''

اہل ملک اور ترقی تربیت (صفحہ:20)

(20/ستمبر 1867ء)

سر سید احمد خان اس مقالے میں کہتے ہیں کہ ہم لوگ اہل یوروپ کو ایک شائستہ اور تربیت یافتہ قوم کہتے ہیں۔ وہ لوگ نہ ایک قوم ہے اور نہ ایک مذہب رکھتے ہیں۔ مگر انہوں نے اپنے ملک میں بلا لحاظ قوم و مذہب کے عام تربیت اور شائستگی پھیلانے سے ملکی فخر اور امتیاز کا خطاب حاصل کیا ہے۔ سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ غور کرنے کی بات ہے کہ نیچر نے قوموں کی خصلتوں اور طبیعتوں کا اختلاف زیادہ تر ملک کی خاصیت پر رکھا ہے۔ اسی طرح جس مسلمان قوموں کی اصلیت کچھ ہی ہو۔ مگر ایک ہی عرصہ دراز تک سکونت اختیار کرنے کے سبب نیچر نے ان کے خون کو ان کی اصلیت کو بدل دیا ہے۔ جس طرح اور قومیں ہندوستان میں آکر آباد ہوگئیں ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کا خون اور گوشت پوست ہندوستان ہی کی پیداوار ہے۔ سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ یہ سچ ہے کہ دونوں قومیں کیسی ہی مٹ کیوں نہ جائے اُن کا آبائی فخر مٹنے والا نہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بڑوں کے نام پر عزہ کرنا اور آپ کچھ نہ ہونا عقل کی بات نہیں۔ اپنے حال پر رونا چاہئے۔ نہ کہ بزرگوں کے نام پر معزور ہونا۔ کیونکہ ہمارے بزرگوں نے اپنی کوشش کے ذریعہ سے بہ نسبت اپنے بزرگوں کے زیادہ علم و ہنر کے خزانوں پر رسائی حاصل کی تھی۔ ہم نے کچھ نہیں کیا بلکہ کمائی ہوئی بزرگوں کی دولت وہ بھی کھو بیٹھے۔ دوسری قومیں علم و ہنر شائستگی کی دولت سے مالا مال ہے۔ سر سید احمد خان افسوس کے ساتھ کہتے ہیں کہ ترک و عرب فارس ذلت و خواری اٹھا رہے ہیں۔ جس طرح ہم اٹھا رہے ہیں۔ یوروپ کے بہت سے ملک ہماری دسترس سے باہر ہے۔ البتہ انگلستان کے علم کے خزانوں پر ہماری دسترس ممکن ہے۔ اور ہم اسی قوم کے ذریعے سے پھر اپنے آپ کو ایک اعلیٰ درجے کی تربیت اور شائستگی پر پہونچا سکتے ہیں۔ سر سید احمد خان اپنے تقریری مقالے کا اہم مقصد

بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''ملکی فخر و امتیاز حاصل کرنے اور اپنی شائستگی و تربیت کی ترقی دینے کو ہم کو بھی وہی کرنا چاہیئے جو یوروپ کی قوم یا ہمارے مسلمان بھائی انگلستان کی قوم نے کیا۔ اس نے علم کی ترقی کے ذریعہ ہی نہایت اعلیٰ رتبہ کا نام پایا۔ سر سید احمد خان اپنے مقالے میں یوروپ کے ایک بہت بڑے عالم نے قومی تعلیم پر ایک مضمون لکھ کر اس کے آخر میں چند فقرے لکھے تھے اس پر روشنی ڈالتے ہیں کہ۔

> ''ہر ملک کی حالت اس کے رہنے والوں کی طبیعت پر قائم رہتی ہے۔ جہاں کے رہنے والوں کو طبیعت مستقل اور ان کا دل روشن، اخلاق اچھے ہوتے ہیں۔ ملک کی حالت بھی اچھی ہوتی ہے۔ اور جہاں عوام الناس کے دلوں پر تاریکی چھا جاتی ہے۔ وہاں تنزل شروع ہوتا ے اور رفتہ رفتہ زوال آجاتا ہے۔''

سر سید احمد خان اس قول کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس بڑے عالم کا یہ قول ہماری ملکی ترقی تربیت و شائستگی کے لیے عمدہ اور دستور العمل ہے۔ سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ غور طلب بات یہ ہے کہ جو قومیں زمانہ حال میں فخر و امتیاز رکھتی ہے اور جو پچھے زمانے میں رکھتی تھی۔ سب نے بالا تفاق اپنی اپنی زبانوں میں علم کے پھیلانے سے وہ بڑائی اور بزرگی حاصل کی۔ یونانیوں نے بڑا حصہ علوم و تربیت کا مصرعوں سے پایا تھا۔ اور اپنی زبان میں ترجمہ کر کے رواج دینے کے ملکی فخر و امتیاز حاصل کیا تھا۔ روس میں جب لوگ ترقی و تربیت پر متوجہ ہوئے تو سب سے اول بادشاہ پیٹر دی گریڈ نے اجنبی مصنفوں کی عمدہ تصنیفات کے ترجمہ اپنی زبان میں چھپوائے جبکہ سکندر کے ہاتھ سے عصائے شاہی گرا عظیم الشان سلطنت کے ٹکڑے ہو گئے۔ شارلی میں بونا پارٹ کا بھی یہی حال ہوا۔ لیکن جو درخت روسی فتح مند پیٹر آعظم نے بویا تھا۔ وہ اب تک قائم ہے اور روز بہ روز

تازہ ہوتا رہے گا۔ وہ درخت علم کا ہے۔ جس کو اس نے اپنی ملکی زبان کی آبیاری سے سرسبز و شاداب کیا تھا۔ دوسرے بادشاہوں کی طرح پیٹر آعظم نے سلطنت کا تکیہ تلوار پر نہیں کیا بلکہ سلطنت کی بنیاد علوم و شائستگی پر قائم کی۔ سرسید احمد خان اپنے مقالے میں کہتے ہیں کہ تمام قوم کے علوم فنون کو اپنی زبان میں ترجمے کریں۔ اگر تمام علوم ہماری زبان میں ہوتے تو بہت زیادہ لائق اور قابل آدمی کو بھی اہل ہند کے سامنے ایسے کھڑا ہونے کی جرأت نہ ہوتی۔ غرض یہ کہ جب تک تمام علوم وفنون اپنی زبان میں نہ ہو عام تربیت اور شائستگی کسی ملک کی ہونی ممکن نہیں۔ سرسید احمد خان اپنے مقالے میں اس بات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں کہ ہر مقام پر اپنی زبان یعنی ایسی زبان جس کو ہر شخص سمجھتا ہو اور بات چیت کرتا ہو، خواہ وہ ملک کی اصل زبان ہو یا نہ ہو۔ سرسید احمد خان آخر میں کہتے ہیں کہ اس مضمون کو پیش کرنے کا مقصد کچھ اور نہیں بلکہ صرف میرے خیالات مثبت ترقی تربیت اہل ہند کے ہیں۔ جو بات ترقی اہل ہند کے لئے مفید ہے وہ سب غور کریں اور جو عمدہ قرار پائے تو ہم سب اس کی پیروی کریں باقی خدا ہمارے ساتھ ہے۔ آمین

ہومیاپیتھی طریقہ علاج اور اُس کے فوائد (ص:36)

(17/ڈسمبر 1867ء)

سرسید احمد خان اپنے مقالے میں کہتے ہیں کہ بیماریوں کا علاج ایک ایسی چیز ہے کہ ہر چھوٹے بڑے امیر غریب کو بلکہ ہر ایک جاندار کو اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ ''علم الابدان یعنی انسان کے جسم کی بیماریوں کا علم'' ہماری زندگی میں کوئی بھی علم اس علم سے زیادہ توجہ کا مستحق نہیں ہے۔ سرسید احمد خان کہتے ہیں کہ بعض چیزوں کی شروعات ہمارے بزرگوں نے کی تھی اور ہم نے اس میں تھوڑی سی ترقی دے کر ایسے عمدہ اور خوب صورت بنالیا ہے لیکن لوگ غلطی سے اس کو ایک

نئی چیز سمجھنے لگے۔ ہومیا پیتھی بھی اس قسم کی چیز ہے۔ جس کو لوگ غلطی سے نیا قاعدہ علاج کا خیال کرتے تھے۔ جبکہ اس کی جڑ بہت پرانے وقتوں سے چلی آتی ہے۔ ڈاکٹر ہنمین نے صرف اس کو پانی دے کر تروتازہ کیا ہے۔ بڑے ڈاکٹروں نے اور عالموں نے اس کی سچائی اور عمدگی کا اقرار کیا ہے۔ اس کی ترقی روز بروز امریکہ، انگلینڈ، آئرلینڈ، فرانس آسٹریا میں ایسی ہوتی ہے جیسے کہ سورج کے ابھرنے کے وقت دن کو۔ سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ اے میرے دوستو! ہر ایک چیز کو بے تعصبی سے دیکھو جس کو عمدہ پاؤ اختیار کرو۔ خواہ وہ الوپیتھی ہو یا ہومیا پیتھی اور کچھ۔ نیچر یعنی قاعدہ قدرت اسی بات کی ہم کو ہدایت کرتا ہے۔ سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ ہومیا پیتھی کے اصول نیچر یعنی قواعد قدرت پر مبنی ہے تو جب سے ہومیا پیتھی کے بھی اصول تھے پھر مجھ کو یوں کہنا چاہئے کہ جب سے الوپیتھی کا وجود تھا اُسی وقت سے ہومیا پیتھی کے اصول بھی لوگوں کو معلوم تھے۔ سر سید احمد خان اس بات پر روشنی ڈالتے ہیں کہ گویا نیچر یعنی حکمت حکیم کے متعلق نے ہم کو یہ نشان بتا رکھا ہے۔ کہ جو دوا حالت صحت میں جس بیماری کے آثار پیدا کرنے والی ہے وہی دوا حالت مرض میں اس کا علاج ہے۔ پس ہومیا پیتھی کسی آدمی کا بنایا ہوا علاج نہیں بلکہ نیچر یعنی قدرت کا بنایا ہوا ہے۔ ڈاکٹر ہنمین نے ان اصولوں کو ایجاد نہیں کیا بلکہ صرف دریافت کیا ہے۔ سر سید احمد خان اس مقالے میں یہ کہتے ہیں کہ کوئی بتا سکتا ہے جن چیزوں سے بجلی پیدا ہوتی ہے وہی چیزیں کیوں بجلی کو روک لیتی ہے۔

سر سید احمد خان اپنے مقالے میں اس بات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں کہ ہومیا پیتھی کے قاعدے پر علاج کرنے والے یہ کہتے ہیں کہ جس مرض کے لیے جو دوا دی جاتی ہے اگر اس کو فائدہ نہیں کرے گی تو نقصان بھی نہیں پہنچائے گی اس بات سے لوگ متعجب ہوتے ہیں بجز اس بات کے کہ نیچر نے ان میں ایسی ہی مخفی مناسبت رکھی ہے اور کچھ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ سر سید یہاں ایک

مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ دو قسم کی ہواؤں کا مرکب ہے ایک اکسیجن اور دوسرا ہائیڈروجن مگر ہمیشہ ایک حصہ O_2 میں 8 حصہ ہائیڈروجن ملی رہتی ہے۔ ہم ان دونوں ہواؤں کو الگ الگ بنا سکتے ہیں مگر جب O_2 کو ہم نلی سے باہر نکال دیں تو فوراً 8 حصے ہائیڈروجن جن کو اپنے میں ملا لے گی۔ اب فرض کرو مرض کی تشخیص میں غلطی ہوئی جو دوا دی گئی تھی وہ مرض کے مشابہ تھی تو وہ مرض کو فائدہ تو نہ دے گی اور نہ کچھ نقصان کرے گی کیونکہ دوا بے حد قلیل ہونے کے وجہ سے کچھ بھی موثر نہ ہوگی۔ سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ ڈاکٹر ہنمین جرمنی کا رہنے والا الوپیتھی ڈاکٹر تھا۔ لیکن وہ الوپیتھی علاج سے ناخوش تھا۔ وہ ہمیشہ سونچتا تھا کہ لوگ کیوں اچھے ہوتے ہیں کیوں مر جاتے ہیں۔ جس دوا سے ایک مرض کو ایک دفعہ صحت ہوتی ہے دوسری دفعہ اسی مرض کو صحت نہیں ہوتی ہے مگر وہ خوب جانتا تھا کہ اُن کا نتیجہ صرف آزمائش اور امتحان پر مبنی ہے۔ ابتداء ہنمین کا قاعدہ تھا کہ ایک مرض کے لئے ایک ہی دوا کی مقدار قلیل کر کے یہ تجویز کیا تا کہ اگر تھوڑی دوا سے مطلب حاصل ہو جائے تو زیادہ دوا دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اکثر حالتوں میں ایسے معلوم ہوا ہے کہ مناسب دوا کی زیادہ مقدار دینے سے مرض اور زیادہ ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ہومیا پیتھی کے معالج قلیل دوا دیتے ہیں۔ سر سید احمد خان اپنے مقالے میں اس بات کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ الوپیتھی اور ہومیا پیتھی ان دونوں اصولوں کا معالج ایک ہی دوائیں استعمال کرتے ہیں لیکن ہومیا پیتھی والے ایک مرض کے لئے ایک دوا جبکہ الوپیتھی والے بہت سی دوائیں ملا کر مریض کو دیتے ہیں۔ اور اس کی کوئی قابل فہم وجہ بیان نہیں کر سکتے ہیں۔ جس سے کسی شخص کی سمجھ میں آئے کہ کس واسطے 3 تا 4 دوائیں مرکب بنا کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ہر دوا کا اثر مختلف ہوتا ہے۔ مریض اچھا ہونے کے بعد یہ طئے کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کون سی دوا کا اثر زیادہ ہوا۔ سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ برخلاف اس کے ہومیا پیتھی کے اصول کو ہر شخص عقیل اور فہیم سمجھ سکتا ہے۔ سر سید احمد خان مقالے کے آخر میں

شفا خانے کے قائم کی مبارکباد دیتے ہوئے درخواست کرتے ہیں کہ اپنی فرصت کے اوقات میں یہاں تشریف لاکر بیماریوں اور بیماروں کا حال اور کیسی بیماریاں خوشگوار علاج سے آرام باقی ہے۔ ملاحظہ کریں تا کہ میں نے جو کچھ کہا اس کو آنکھ سے دیکھ کر خود آپ کو یقین اور تجربہ ہو جائے۔

جواب مضمون: سویلزیشن یعنی شائستگی اور تہذیب پر (صفحہ:59):

سر سید احمد خان اپنے جوابی مضمون میں کہتے ہیں کہ سویلیزیشن یعنی شائستگی کے لفظ کو عام اصطلاح میں لفظ سمجھنا چاہئے جس سے اعلیٰ ترقی یافتہ اور شائستہ قوموں کی حالت ان قوموں کے مقابلہ میں جن کو وحشی یا نصف وحشی سمجھا جاتا ہے سمجھ میں آسکے۔ پس اس معنی کے اعتبار سے ہم یوروپ کو اعلیٰ قوموں کو شائستہ اور تربیت یافتہ کہتے ہے۔ اور چینیوں و تارتاریوں کو اس سے کم شائستہ خیال کرتے ہیں۔ سر سید احمد خان اپنے اس جوابی مضمون میں ان ذریعوں کو لکھتے ہیں۔ جن سے شائستگی کو ترقی حاصل ہوتی ہے۔ ان ذریعوں میں پہلا ذریعہ آدمی کی ذات ہے۔ اس لیئے کہ اس کے اعضاء اور قوی بہ نسبت اور ذی روح مخلوقات کے افضل اور عمدہ ہے۔ بس آدمی کو اپنی ترقی اور کاحل شائستگی کے واسطے سے مستحکم ذریعے حاصل ہیں اور ان کی اولاد اپنے آبا و اجداد کی محنتوں اور تجربوں سے بہت کچھ مستفید ہوتی ہے۔ یہ بات بغیر کسی تامل کے تسلیم کی جاتی ہے کہ شائستگی اور انسانی کی عقل کی وسعت کے لئے کوئی حد مقرر نہیں۔ سر سید احمد خان کہتے ہے کہ اس کے علاوہ آدمی کے اعضاء اور قوی کے جس خطہ میں وہ رہتا ہے وہ خطہ بھی اس کے لئے ایک ایسا ذریعہ ہوتا ہے جس کے سبب یا اس کی عقل کے مدراج کو ترقی حاصل ہوتی ہے۔ یا اُس کی مزاحمت کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر اس بڑے ذریعہ کی تحقیق کامل طور پر اس صورت سے ہوسکتی ہے کہ اس کو مندرجہ ذیل 5 قسموں میں تقسیم کیا جائے۔

1. وہ قدرتی اسباب جو شائستی کے لئے نہایت مناسب ہے۔

2. اس بات کی ضرورت کہ قوموں کے باہم آمد ورفت ہونی چاہئے۔
3. مذہبی اُمور کی شائستگی کی نسبت اثر
4. وہ تعلقات جو حکومتوں کو اسباب شائستگی کے ساتھ ہیں۔
5. صلاحیت مختلف قوموں کی شائستگی قبول کرنے کے واسطے۔

سرسید احمد خان کہتے ہیں کہ جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے بخوبی ظاہر ہے کہ آدمی کا شائستہ ہونا صرف ان عادات کے کرنے پر موقوف ہے۔ جو خون خوار وحشیوں کے خواص میں سے ہیں اور جو خاص اپنے زمانہ میں پیدا ہوتی ہے۔ جس میں کسی طرح تہذیب وتربیت نہ ہو۔ اس قسم کی صفات میں جیسے کہ جنگ جوئی، شکار بازی، غارت گری جا بجا نقل مکان کرنا وغیرہ۔ سرسید احمد خان جواب مضمون کے آخر میں کہتے ہیں کہ جو حقوق انسان کو قدرتی حاصل ہے ان کو باہمی معاشرت کے معاہدے سے مستحکم کرنا ہے۔ غرض اسی حالت کا نام شائستگی ہے۔ اور ان سب کے سبب سے طبیعت کی تمام قوتیں ظاہر اور شگفتہ ہو جاتی ہے اور اسی کی بدولت علم کے خزانے کھل جاتے ہیں۔ اور پھر اُن کا ایک دریائے فیض دور دور تک بہنے لگتا ہے۔ اور پھر معقول اور پند آمیز گفتگو اور انسانیت کی اور بہت سی باتوں کی تحقیق اور تکمیل سے انسان کو شہری ہونے کا رتبہ حاصل ہوتا ہے۔ جو وحشیوں کی درجہ سے بلند ہے۔

رسم ورواج کا فلسفہ اور اُس میں اصلاح کی ضرورت (صفحہ:80)

(3/نومبر 1873ء)

سرسید احمد خان اپنے مقالے میں رسم ورواج کے فلسفہ کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رسم جو ہمسایہ پرکھوں سے ہوتا چلا آیا ہے۔ ہم کو یہ بھی نہیں پتہ کہ کیوں ہوتا تھا اور اس سے کیا فائدہ

ہے۔رواج جس کوسب لوگ کرتے ہوں جس کے کرنے کولوگ غیب نہ سمجھیں۔سرسید احمد خان اپنے مقالے میں سر والٹر ریلی کی عمدہ بات جوانہوں نے بیان کی تھی۔ بتاتے ہیں کہ ’’رسم ورواج میں وہ فرق ہے جوسبب اورنتیجہ میں ہیں۔کیونکہ جب کسی کام کا رواج مدت تک رہتا ہےتو وہ بطور ایک قانون کےلوگوں میں پھیل جاتا ہے۔اورآخرکو یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ ایک رسم ہوجاتی ہے۔سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ رسم ورواج کا ایک بڑا حصہ ملکی قوانین کا ہے۔اس کا وجود ہرایک ملک اور ہرایک عمل داری میں پایا جاتا ہے۔انگلستان میں جوقوانین کامن لاء کہلاتے ہیں وہ حقیقت میں وہی بن لکھےقوانین ملکی رسم ورواج کے ہیں۔پس ہمارے ہندوستان میں جورسم ورواج ہے وہ ہمارے ملک کے کامن لاء ہے۔سرسید احمد خان کہتے ہیں کہ کامن لاء کے لیے کچھ تحریری کتابیں نہیں ہوتی۔ بلکہ کامن لاء پرنہایت بڑی بڑی کتابیں بہت بڑے لائق اورقابل اورواقف عالموں نےلکھی ہیں۔فرق یہ ہے کہ کامن لاء پہلے جاری ہوتا ہے۔اس کے ضبط تحریر میں آتا ہےسرسید احمد خان مذہبی قانون کے مطابق کہتے ہیں کہ میری رائے ہیں کہ مذہب میں رسم ورواج پیدا ہونے کا ایک سبب ہوتا ہے۔مگر جب تک کہ اس کے مسائل بطور رسم ورواج کے جاری نہ ہوجائے رسم و رواج سے زیادہ قوت نہیں رکھتا۔رسم ورواج کی حکومت انسانوں کے دلوں میں نہایت قوی اور سب سے زیادہ مستحکم ہوتی ہے۔تعجب یہ ہے کہ جاہل اور عالم نادان اورعقل مذہب برابر اس کی غلامی کرتے ہیں۔فلاسفی حکمت کے باریک مسئلے حل کرتا ہے۔ جب ان باتوں تک پہونچتا ہے جن کا رسم ورواج مدت سے چلا آتا ہے۔تو تمام اپنی قابلیت اورعقل وتمیز بھول جاتا ہے۔ یہ تمام باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ رسم ورواج کا تعلق مذہب اورحکومت اورمعاشرت سب سے برابر ہے۔سرسید احمد خان’’کرے سسٹم‘‘ کا قول بیان کرتے ہیں کہ’’وہ قوم غلامی کی حالت میں ہے۔ جس پرقانون حکومت کرتا ہے۔اورآزادقوم وہ ہے۔جس پررسم ورواج کی حکومت ہوتی ہے۔‘‘ میں سمجھتا ہوں کہ غالباً میرے ملک کےلوگوں کی بھی یہی رائے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا ہندوستان

قانون کے بوجھ تلے دبا چلا جاتا ہے۔ سرسید احمد خان کہتے ہیں کہ رسم ورواج کے طرف داروں نے نہایت مضبوط دلیلیں سمجھ کر بیان کی ہے۔ مگر اس کی مخالفت بھی کی گئی ہے۔ مانیشرک مشہور رومی مصنف اس رائے کے بالکل برخلاف ہے۔ اس کا قول ہے کہ ''جس قوم میں جس قدر زیادہ تحریری قانون ہوتے ہیں۔ وہ اتنی ہی آزاد ہوتی ہے۔ اس نے پرشیاء کے بادشاہ کو نہایت حقارت سے دیکھا ہے کیونکہ اس نے تحریری قوانین بہت گھٹا دیئے تھے۔ سرسید احمد خان کہتے ہیں کہ رسم ورواج کا تعلق جہاں تک مذہب اور حکومت سے تھا۔ اس کا بیان کر چکا ہوں اب معاشرت سے اس کا تعلق جو ہے اُس کی زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ کوئی قوم بلکہ کوئی خاندان ایسا نہیں ہے جس میں عجیب وغریب رسمیں نہ ہوں گویا تمدن ومعاشرت رسم ورواج پیدا ہونے کا سبب ہے۔ رسومات میں اصلاح کرنے کی ضرورت خود انسان کی حالت پر غور کرنے سے ثابت ہوتی ہے۔ جب ہم انسانوں کی حالت پر نظر ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہر مذہب کی رسم دوسرے مذہب کی رسم سے مختلف ہیں۔ ایک ہندو اپنے پیارے باپ کی لاش کو نیکی اور ابدی نجات کا یقین سے نہایت خوفناک آگ میں جلاتا ہے۔ مگر ایک یہودی، عیسائی یا مسلمان اس کو نہایت بے رحمی اور تنگ دلی کا کام سمجھتا ہے۔ سرسید احمد خان اپنے تقریری مقالے میں اس بات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں کہ جو لوگ رسموں کی اصلاح وترقی کے برخلاف ہیں وہ خود اُس میں مبتلا ہے جس سے لوگوں کو منع کرتے ہیں کیوں کہ وہ ایک ترقی یافتہ زمانہ کی رسموں کو اپناتے ہیں اور دوسرے ترقی یافتہ زمانے کی رسموں کو اپنانے سے انکار کرتے ہیں۔ اس کا بڑا سبب بے عملی یا ناقص تعلیم انہیں چاہئے کہ وہ رسومات جو تعصب اور جہالت پر عادتاً ان کے دل میں بیٹھی ہوئی ہے۔ انہیں انصاف سے دیکھیں کہ درحقیقت کیا حقیقتیں ہیں اور اُن کی ترقی اور اصلاح کی ضرورت ہے یا نہیں۔ رسومات کی اصلاح و ترقی انسان کے ظاہری طریقہ زندگی کے ساتھ اس کی عقل کو بھی ترقی دیتی ہے۔ کون سی رسم اچھی اور بری ہے۔ اس کا جانچنا اور تصفیہ کرنا بھی کچھ آسان کام نہیں ہے۔ مگر زمانہ اور تعلیم وتربیت خود

اچھی اور بری رسموں کو جدا جدا کرنا ہے۔سر سید احمد خان اپنے مقالے میں اس بات پر بھی روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس شخص کے دل میں اصطلاح وترقی کا خیال ہواس کو چاہئے کہ خود نہایت استقلال اور مضبوطی اور بہادری سے قوم سے اختلاف کرے اوراس رسم کوتوڑ دیں۔ یااس میں اصلاح وترقی کرے۔ پس یہی ایک طریقہ اختلاف ہے۔اورایسا کرنے والا ہی سچا خیر خواہ اپنی قوم کامنصور ہے۔سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ پچھلےاورحال کے زمانے میں جن لوگوں نے اپنی قوم کی بھلائی چاہی ہےانہوں نے اسی طریقے پرعمل کیا۔دیکھو! ساڑھےاڑتیس سو برس پیش تر اور کلدانیاں'' میں ایک نوجوان جس کا نام ابراہیم تھااس نے اپنی قوم کی بت پرستی میں پڑااور بری رسموں میں پھنسا ہوا تھا۔خدا نے اس کی مدد کی اور وہ اپنی قوم کے برخلاف کھڑا ہوا۔لوگوں نے اس کوقتل کرنا چاہا آگ میں ڈالنا چاہا مگر خدا نے بچالیا۔اور پھرانجام یہ ہوا کہ وہی ابراہیم تمام دنیا کی قوموں کے لئے رحمت ٹھہرے۔دیکھوراجارام موہن رائے نے کس طرح اپنی قوم سے مخالفت کر کے ہرقسم کی رسومات میں اصطلاح کی۔اورکتنی کچھ نیکی اپنی قوم میں پھیلائی۔آخر میں سرسید احمد خان قوم سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ اے میرے دوستو یہ زمانہ ایسا ہے کہ ہرایک کے دل میں تہذیب وشائستگی کی امنگ ہے۔ بہت سے لوگ ہزاروں رسموں کوفضول اورلغو سمجھتے ہیں۔اور ذرا برابراُس پر یقین نہیں رکھتے پر کرتے ہیں۔اور بہت سی ایسی باتیں ہے۔جن کے بےنقص ہونے پر یقین کرتے ہیں۔ پر کرتے نہیں۔ایسی باتوں سے کچھ قوم کی بھلائی نہیں ہوسکتی۔ بلکہ میری سمجھ میں یہ بھی ایک قسم کی دغابازی ہے۔میری نصیحت یہ ہے کہ کرواُس کوجس پرتم کودلی یقین ہے۔اور مت کروجس پرتمہیں دلی یقین نہیں۔یہی اصل سچائی ہےاوریہی بات ہے۔جس پر دونوں جہاں کی نیکی منحصر ہے۔

ملکہ وکٹوریہ کی سوانح اور شہر لندن کے حالات (صفحہ:106)

(29/مئی 1874ء)

سرسید احمد خان نے اپنے اس مقالے میں ملکہ وکٹوریہ کی سوانح حیات کو پیش کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ وکٹوریہ 24/مئی 1819ء میں کنزنگٹن میں پیدا ہوئی۔ چھوٹی عمر میں ہی والد کا سایہ سر سے چلا گیا۔ان کی پرورش ان کی والدہ ماجدہ نے بھرپور طریقے سے کی تھی۔ والدہ ماجدہ کا نام ڈچس آف کینٹ ہے۔ جو بادشاہ بلجیم کی بہن تھیں۔ والدہ نے پہلے وکٹوریہ کو ورزش سکھائی اس کے بعد گھوڑے سواری اور جہازی سفر وغیرہ امور کی تعلیم دی۔ اور وکٹوریہ کے اندر بچپن سے ہی اعتدال اور کفایت شعاری داخل کی گئی۔ جو بادشاہوں کے لئے ضروری ہے۔ وائی کونٹ مل برن صاحب نے وکٹوریہ کو اُن تمام اصول انتظام سلطنت کی تعلیم دی جن کے بموجب اس وقت انگلستان کی سلطنت میں کارروائی ہوتی تھی۔ اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب بادشاہ ولیم چہارم کے بعد صحیح نسبت وارث سلطنت نہ رہا تو قانون انگلستان کے 20/جون 1837ء کو وکٹوریہ کو تخت نشین بنایا جو اس وقت اس عہدہ کے لائق تھی۔ وکٹوریہ کی شادی 10/فروری 1840ء کو ہوئی۔ اور 1841, میں پرنس آف ویلز ولیعہد سلطنت پیدا ہوئے۔ سرسید احمد خان اپنے مقالے کے دوران ایک بڑے مصنف لارڈ بروہم کا قول بیان کرتے ہیں کہ ''کسی ملک میں ایسی ملکہ آج تک پیدا نہیں ہوئی (جو پبلک اور پرائیوٹ باتوں میں) وکٹوریہ سے بڑھ کر قابل تعریف اور رعایا کی شکر گزاری کی مستحق ہو '' سرسید احمد خان اس بات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں کہ ایشیاء کے بادشاہوں کو یہ اختیار تھا کہ جس شخص کی بہ نسبت جو حکم چاہیئے دے اور جس کام میں چاہے خزانہ صرف کریں جبکہ انگلستان کے بادشاہوں کی حالت بالکل اس کے برعکس تھی یہاں بادشاہ کے اختیارات محدود اور تمام قوانین جس پر سلطنت کی کل کارروائی منحصر ہوتی ہے۔ رعایا کی منظوری کے بعد جاری ہوتے تھے۔ بادشاہ کو ہرگز

اختیار نہیں ہے کہ سلطنت کے خزانے کو اپنی مرضی سے صرف کردے۔ سرسید احمد خان اپنے مقالے میں اس بات کا بھی تذکرہ کرتے ہیں کہ ہمارے ملک ہندوستان میں ایسے حقوق حاصل نہیں جو کہ رعایا انگلستان کو حاصل ہے۔ یہاں لوگوں کی رائے کو کوئی وقعت حاصل نہیں۔ یہ تمام خرابی اس لیے ہے کہ ہم لوگوں نے ابھی ایسی لیاقت حاصل نہیں کی ہے۔ جو کہ انگلستان کی رعایا ہے جیسے حقوق ہم کو حاصل ہو۔ پس ہمارے ملک والوں کو اگر انگلستان کی رعایا کے سے حقوق کی آرزو ہے تو ان کو بھی ویسی ہی لیاقت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

سرسید احمد خان اپنے تقریری مقالے کو آگے بڑھاتے ہوئے شہر لندن کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ لندن تمام دنیا میں بڑا اور قدیم شہر ہے۔ 20 میل لمبا اور 10 بارہ میل چوڑا جس میں قریب 30 لاکھ آدمی آباد ہے۔ خوبصورتی میں پیرس اور عمدگی میں قسطنطنیہ سے بہتر نہیں۔ لیکن آبادی اور مال و دولت میں اب دنیا میں کوئی ہر اُس کی ہمسری نہیں کرسکتا۔ طرز عمارت میں پہلے کی بہ نسبت ترقی ہوگئی ہے۔ کچھ پرانے مکانات موجود ہے۔ جیسے دیکھنے پر اُس وقت کی طرز عمارت کا حاصل معلوم ہوتا ہے۔ 1665ء میں اس شہر میں ایک بڑی وبا پھیلی تھی جس میں انسانوں کی جانیں تباہ ہوگئیں تھیں۔ 1666ء میں ایک عظیم آتش زدگی میں 13 ہزار گھر جل کر خاک ہو گئے۔ یہ دونوں آفتیں شہر کی طرز عمارت کی وجہ سے پیش آئی تھی۔ پس اُس وقت سے عمات کا طرز بدلا گیا۔ 1666ء کی آتش زدگی کی یاد میں ایک بہت بڑا مینار جو 2 سوفٹ بلند ہے۔ تعمیر کیا گیا۔ جسے دیکھ کر لوگ اس بڑی مصیبت کی یاد دہانی کرتے ہیں لندن کے مشہور مکانات میں ایک مکان ٹور آف لندن ہے۔ ملکہ الزبتھ اور کنگ جیمس کے زمانہ تک وہ محل بادشاہوں کے رہنے کا مکان تھا۔ بعد میں قید خانہ ہوگیا جہاں بڑے بڑے بادشاہوں، سرداروں کی گردنیں کاٹی گئی اور خون بہائے گئے۔ سرسید احمد خان اپنے مقالے میں اس بات پر بھی روشنی

ڈالتے ہیں کہ لندن میں ایک ادنیٰ بات یہ ہے کہ جو کوئی بازار میں جس سوداگر کے یہاں سے سودا لیتا ہے۔اس کے ساتھ نہایت اخلاق وانسانیت سے پیش آتا ہے۔نہ کچھ تکرار نہ لڑائی۔اب ہم لوگوں کو غور کرنا چاہیئے کہ وہاں ادنیٰ ادنیٰ موقع پر بھی کس درجہ کی سچائی برتی جاتی ہے۔ایسے نہیں کہ وہاں بدمعاش لوگ نہیں ہیں۔قابل تعریف یہ ہے کہ بدمعاش کے ساتھ وہاں نیکی اور راست بازی کس قدر موجود ہے۔اور یہی وجہ ہے کہ اس کی خوبی اور نیک نامی اور تجارت دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے۔اور یہ سب باتیں عمدہ تعلیم کی بدولت ہے۔سرسید احمد خان اپنے اس مقالے میں اس بات کا بھی تذکرہ کرتے ہیں کہ ایک زمانے میں ہماری قوم کی تعلیم بھی عمدہ تھی۔اور ساری خوبیاں موجود تھیں۔جب سے ہماری تعلیم ناقص ہوگئی ہے ہم میں وہ تمام خوبیاں جاتی رہیں۔ایک وقت میں ہماری قوم کے یوروپ کی قوموں کو نفع پہونچایا تھا۔بڑے مصنفوں نے اس بات کا قرار کیا ہے کہ اگر مسلمان علوم وفنون میں ترقی نہ کرتے تو آج ان قوموں کو ایسا فائدہ نہ پہونچتا اور نہ آج دنیا میں علوم وفنون کا نام ہوتا۔سرسید احمد خان اس بات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں کہ ہم اور وہ قوم جس نے ایک زمانے میں ہم سے علم حاصل کیا اور اب ہم سے بہت اعلیٰ درجہ پر پہونچ گئی ہے۔جو قرض ان لوگوں نے ہم سے لیا تھا وہ اب ہم ان سے وصول کریں گے۔سرسید احمد خان اس قوم کا سچے دل سے شکر ادا کرتے ہیں کیونکہ وہ قوم اُس قرض کو مع سود دینے کے لئے بڑی فیاضی سے حاضر ہے مگر ہم اپنے تعصب اور جہالت کی وجہ سے ان سے محروم ہے۔سرسید احمد خان آخر میں اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہے۔کہ ہماری قوم ایک دل ہو کر کوشش کریں اور آپسی ضد اور بغض اور حسد سے موقع کو برباد نہ کریں۔

مدرستہ العلوم کی ضرورت (ص:117)

(27/جنوری 1883ء)

سر سید احمد خان اپنے تقریری مقالے میں کہتے ہیں کہ ملک کی بھلائی کے لئے خود ہمارا ملک اورقوم کی بھلائی کے لیے خود ہماری قوم اور خاندان کی بھلائی کے لئے خود ہمارا خاندان ہمارے لیے استاد ہے۔ جو حالتیں اُن پر گزری ہیں اور گزر رہی ہیں انہیں غور کرنا ہماری نصیحت اور عبرت کے لیے کافی ہے۔ ان تینوں کی موجودہ حالت پر نظر ڈالیں اوراس سے آئندہ کے لئے نصیحت حاصل کریں۔ جو لوگ ملک کی بھلائی چاہتے ہیں ان کا پہلا فرض یہ ہے کہ بلا لحاظ قوم و مذہب کے کل باشندگان ملک کی بھلائی پر کوشش کریں۔تمہارے ملک ہندوستان میں دوقومیں ہندو اور مسلمان کے نام سے مشہور ہیں۔ اور ہندوستان دونوں قوموں کا وطن ہیں۔ اور دونوں قوموں کے اتفاق اور باہمی ہمدردی اور آپس کی محبت سے ملک کی اور ہم دونوں کی ترقی و بہبودی ممکن ہے۔ سر سید احمد خان افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ افسوس ان لوگوں پر جو اس نکتے کو نہیں سمجھتے اور آپس میں ان دونوں قوموں کے تفرقہ ڈالنے کے خیالات پیدا کرتے ہیں اور وہ یہ نہیں سمجھتے کہ وہ خود اس نقصان میں شامل ہے۔ سر سید احمد خان قوم کی حالت پر نظر ڈالتے ہوئے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہماری قوم اپنے باپ دادا کے گیت گاتی ہے۔ خود کچھ نہیں کرتی، تمام ہندوستان میں ہماری قوم سب قوموں میں جاہل ہے۔ جو چیز سب قوموں سے زیادہ اُن کے پاس ہے۔تو وہ ہے خود اپنی قوم سے بغض، عداوت، حسد، بدخواہی، بداندیشی، قومی عزت، ہمدردی اور قومی افتخار کا ان میں نام نہیں ہے۔ سر سید اس تعلق سے کہتے ہیں کہ جو شخص اپنی عزت کا خواہاں ہو اس کا فرض ہے کہ قوم کو معزز کرنے میں سب سے زیادہ کوشش کریں۔ جن لوگوں نے کچھ کیا ہے وہ کرنا ذاتی غرض سے خالی نہیں۔ عام بھلائی کے کام میں ذاتی غرض کی

برکت اس کے ثمرے دونوں کو مٹا دیتی ہے۔ یہی بڑا نقص ہماری قوم میں ہے۔ اسی وجہ سے ہماری قوم ترقی نہیں کر سکی۔ اور روز بروز تنزل کرتی جاتی ہے۔ سر سید احمد خان اپنے تقریری مقالے میں اس بات کا تذکرہ بھی کرتے ہیں کہ چند بزرگ ایسے ہیں جو مدرسۃ العلوم واقع علی گڑھ میں مدد کی ہے۔ وہ غریب آدمی ہے جنہوں نے ایک ایک دو، دو مہینے یا اس سے بھی زیادہ اپنا اذوقہ مدرسے کو دے دیا مگر امیر انہوں نے کچھ نہیں کیا۔ سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ ہماری کوشش دنیاوی ترقی اور دنیاوی عزت میں اسلام کی شان وشوکت کی نیت سے ہونی چاہئے۔ جس کو میں اصلی محبت اسلام واصلی ثواب کے کام سے تعبیر کرتا ہوں اور یہی خیال سے چند قوم کے ہمدردوں نے علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم قائم کیا۔ وہاں پانچگانہ نماز ہوتی ہے۔ سنی وشیعہ طالب علم آپس میں محبت والفت سے رہتے ہیں۔ دونوں فریق کی دنیاوی تعلیم ہوتی ہے۔ اگر قوم قوی ہمدردی پر توجہ دیں تو ایسے 100 مدرسے قائم ہو سکتے ہیں۔ وہ بھی اب تک عدم توجہ کے سبب پورا نہ ہو سکا۔ سر سید احمد خان خاندانوں کی حالت پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک بڑے سیاح کا قول بیان کرتے ہیں کہ ”قوم کی خوشحالی یا بربادی کا ثبوت اُس قوم کی عمارتوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ دیکھو تمہاری قوم کے قدیم خاندان جن کا ادب اور وقار اب تک تمہارے دل سے نہیں گیا۔ کس حال میں ہیں۔ مسلمانوں کی ترقی زمانہ کی چال کی مناسبت سے ہوتی ہے۔ جس طرح تمہارے بزرگوں کے خاندان بنے تھے نام ور ہوئے تھے ترقی پائی تھی اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ زمانے نے اپنی چال بدل دی مگر تم اس چال پر قائم ہو۔ سر سید احمد خان اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس زمانے میں فتح یابی اسی کو حاصل ہے۔ جو تعلیم وتربیت میں ترقی پائیں۔ مگر ہمارے خاندان کے نوجوان لڑکے تعلیم وتربیت سے عاری ہیں ایسے میں ہم کو موجودہ خاندانوں کے قائم رہنے یا نئے خاندانوں کے قائم ہونے کی توقع ہو سکتی ہے۔ آخر میں سر سید احمد خان اپنے مقالے میں کہتے ہیں کہ اس وقت

خاندانوں کا سنبھلنا اور قوم کی عزت پانا محال ہے۔ چند بڑے وارڈ انسٹی ٹیوشنوں میں جو ہندستان میں چند امیروں کے لڑکوں کے لئے مقرر ہیں۔ میری رائے میں تربیت نہیں ہوسکتی ہے۔ ہماری قوم کے لیے ایسے بورڈنگ ہاؤس درکار ہو جن کا اہتمام اور نگرانی خود ہمارے ہاتھ میں ہو۔ ہماری قوم کے معزز اور باوجاہت لوگ اس کا انتظام کرتے ہوں وہ لوگ انہیں اپنے بچوں کی طرح اور بچے انہیں اپنے بزرگ باپ کی مانند جانتے ہوں۔ اگر آپ کو اس کا نمونہ دیکھنا ہو تو علی گڑھ کو دیکھ لیں جو ہماری قوم کے بچوں کو تربیت دینے کے قابل ہیں۔

قومی تعلیم، قومی ہمدردی اور باہمی اتفاق (ص:131)

(23/جنوری 1884ء)

سرسید احمد خان اپنے اس مقالے میں کہتے ہیں کہ قوموں کا شمار کسی بزرگ کی نسل میں ہونے یا کسی ملک کے باشندے ہونے سے ہوتا تھا۔ اسلام کسی سے نہیں پوچھتا کہ وہ چین کا ہے پنجاب کا ہے یا ہندوستان کا بلکہ جس نے کلمہ توحید کو مستحکم پکڑا وہ ایک قوم ہوگیا۔ سرسید احمد خان افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم سب آپس میں بھائی تو ہے۔ مگر آپس میں دوستی ومحبت یک دلی ویکجہتی کم ہے۔ حسد وبغض وعداوت کا ہر جگہ بد اثر پایا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ آپس کی نا اتفاقی ہے۔ اور قومی ہمدردی اور قومی ترقی وامور کے انجام میں اس نالائقی ونا اتفاقی نے بہت کچھ بد اثر پہونچایا ہے۔ ہماری قوم کی ترقی آپسی محبت اور ایک جہتی پر مشتمل ہے۔ اس کا مطلب نہیں کہ لوگ اپنے عقائد چھوڑ کر ایک عقیدہ ہو جائیں مگر اتفاق کے قائم رکھنے کے لیے جس چیز کی ضرورت ہے اس کی پیروی قومی اتحاد کا ذریعہ ہوسکتی ہے۔ جب انسان غور کریں تو پتہ چلے گا کہ ہر انسان کے ہستی کے دو حصے ہیں۔ ایک خدا کا حصہ اور دوسرا اپنے ابنائے جنس۔ اس کا مذہب خدا کا

حصہ ہے۔ جس میں دوسرا کوئی شریک نہیں۔ دوسرا حصہ ابنائے جنس یعنی ایکدوسرے کی ہمدردی، باہمی دوستی، محبت ہے۔ اس مجموعے کا نام قومی ہمدردی ہے۔ سرسید احمد خان اس بات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں کہ ہر قوم اور ملک ذاتی ثواب حاصل کرنے کی نیت سے متعدد قسم کے کاموں میں کوشش کرتا ہے۔ بلکہ پیسہ بھی خرچ کرتا ہے۔ دائیں ہاتھ سے آخرت تو بائیں ہاتھ سے قومی بھلائی کے کام کرتا ہے۔ لیکن یہ بات ہماری قوم میں نہیں ہے۔ خوشی کی بات تو یہ ہے کہ ہماری قوم میں اب تک اپنے باپ دادا کا فخر باقی ہے۔ اگلے بزرگوں کی عظمت کو یاد رکھنا بھی قوم کی آئندہ ترقی کی بشارت ہے۔ اس لیے ہم کو اپنی قوم سے امید ہے کہ رفتہ رفتہ وہ بھی ٹھیک راستہ قومی ترقی کا پالے گی۔ اور تمام مختلف خیالات ایک اصل مرکز کی طرف جمع ہو جائیں گے۔ سرسید احمد خان کہتے ہیں کہ انہیں تمام خیالات کا باعث میں نے علی گڑھ میں ایک قومی مدرسہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرے دوست جو درحقیقت بانی مدرسہ کے لقب پانے کے وہی مستحق ہے۔ اس میں مدد دی ہے۔ علی گڑھ میرا وطن ہیں نہ وہاں کوئی جاگیر وزمینداری صرف قومی تعلیم کے لیے مناسب مقام خیال کر کے اس جگہ مدرسہ کی بنیاد ڈالی ہے۔ میں سمجھتا ہوں مدرستہ العلوم ایسے طور پر قائم ہوا ہے جو ایسی تعلیم وتربیت کے اس زمانے میں قومی ترقی کے لئے درکار ہے۔ مناسب ومفید ہے۔ وہ مدرسہ ہماری قوم کے بچوں کے لیے ان کی تعلیم کا گھر ہے۔ اس نے بہت ترقی کی ہے۔ جو کہ امید سے زیادہ ہے۔ قومی کاموں میں صرف گورنمنٹ پر بوجھ ڈالنا اور اُسی کی مدد کے منتظر رہنا بزدلی اور بے عزتی کا نام ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے قومی کام کو خود اپنی مستعدی سے انجام دیں اور گورنمنٹ سے صرف اُس کی امداد کے متوقع رہے۔ اگر یہ ہوگا تو قوم اور گورنمنٹ دونوں اپنا فرض ادا کریں گی۔ سرسید احمد خان قوم کے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اپنے عزیز اور پیارے بچوں کی پرورش اچھی کر وان کی زندگی خراب مت کرو۔ ان کی قومی تعلیم پر توجہ نہ دو گے تو وہ خراب

ہوجائینگے۔آخر میں سر سید احمد خان اپنے اس مقالے میں اپنی پیشن گوئی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی قوم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگراور چند روز تم اسی طرح غافل رہے تو ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ تم چاہو گے کہ اپنے بچوں کوتعلیم دواُن کی تربیت کرومگرتم سے کچھ نہ ہوسکے۔

اسلام کی گزشتہ،موجودہ اورآئندہ حالت (صفحہ:146)

(24/جنوری1884ء)

سر سید احمد خان اس تقریری مقالے میں کہتے ہیں کہ اکثر بزرگوں کو اسلام کی گزشتہ،موجودہ اور آئندہ حالت سن کر تعجب ہوتا ہے۔سر سید احمد خان اس مقالے میں اس بات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں کہ اسلام ایک لازوال نور ہے۔اسلام خود خدا کا نور ہے۔جومثل اُس کی ذات کے ازلی وابدی ہے۔اُسی نور نے آخرکار سینہ مبارک محمدﷺ سے ظہور کیا۔وہ نور نہ کسی خاص قوم کیلئے مخصوص تھا نہ کسی خاص ملک کے لئے وہ تمام دنیا کے لئے روشنی تھا اور روشنی ہے اور رہے گا۔اس میں تغیر کبھی ہوا تھا نہ ہوگا۔اختلاف فرق سے جو مذہب اسلام میں دکھائی دیتے ہیں اس نور میں کچھ نقصان نہیں آتا۔سر سید احمد خان اپنے مقالے میں اس بات کا تذکرہ کرتے ہیں کہ اہل اسلام کی گزشتہ اور موجودہ اور آئندہ حالت نہایت دل خراش ہے۔اسلام کی حالت مسلمانوں کی حالت سے دکھائی دیتی ہے۔انسان کی اچھی اور بری حالت کا ہونا دوامر سے متعلق ہے ایک اخلاقی، دوسرے تمدنی یعنی دنیاوی،سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ اخلاقی حالت کے دو حصے ہیں ایک وہ ہے جس پر نجات عقبی منحصر ہے۔سر سید احمد خان یقین سے کہتے ہیں۔اس حصے میں لا الہ الا اللہ محمدﷺ رسول اللہ پر یقین کرنے والے مسلمان شامل ہے اور دوسرا حصہ جو دنیا میں لوگوں پر نیک اثر ڈالنے والا اور نیکی کا نمونہ بن کر لوگوں کو نیکی کی راہ بتلانے والا ہے۔سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ اس دوسرے حصے

میں تفاوت درجات ہے۔ اگلے زمانے میں نہایت بزرگ یا خداولی اللہ گزرے ہیں۔ جن کی برکت سے لوگوں نے بہت سی ہدایت پائی ہے۔ ایسے بزرگ سے ہمیشہ ہماری قوم کے افتخار کا باعث ہونگی۔ سرسید احمد خان افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بہ ظاہر ایسے بزرگوں سے ہمارا زمانہ حال خالی ہے۔ یا شاید ہماری آنکھیں اس قابل نہیں ہے کہ ہم ایسے بزرگوں کو دیکھیں۔ اسباب میں آئندہ کے لئے پیشن گوئی نہیں کرسکتا کہ ہماری قوم میں ایسے مقدس بزرگ پیدا ہونگے یا نہیں مگر خدا کی رحمت سے نا اُمید نہیں ہوں۔ سرسید احمد خان قوم سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ ہمیں اپنی دنیاوی حالت درست کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ نہ دنیا کے لئے بلکہ دین کے لئے نہ اپنے لئے بلکہ خدا کے لئے۔ سرسید احمد خان کہتے ہیں کہ ہمارے پاس نہ دولت ہیں نہ حکومت نہ علم ہے نہ فضیلت۔ سب سے ذلیل اور تمام قوموں میں بدتر ہے۔ جو کوئی خدا کی خوشنودی چاہتا ہے اُس کا فرض ہے کہ وہ قوم کو اس بری حالت سے نکالنے میں کوشش کریں۔ کوئی عبادت کوئی خیرات، کوئی خیر جاری قومی ہمدردی سے بہتر نہیں ہے۔ سرسید احمد خان اپنے مقالے میں کہتے ہیں کہ قوم کی موجودہ حالت تو تمہارے سامنے ہیں۔ آئندہ حالت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ قوم کی ہمدردی کے ذریعہ سے آئندہ حالت درست ہونگے۔ اپنی اولاد کی جان پر اپنی ارواح پر رحم کرو۔ اور قوم کی بھلائی پر متوجہ ہو۔ اس زمانے میں قومی ترقی صرف زمانہ کے حاجتوں کے موافق تعلیم پر منحصر ہے۔ سرسید احمد خان مقالے کے آخر میں اس بات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ قوم کی خبر لو، قوم کی مدد کرو، قوم کی حاجت روائی کرو۔

تعلیم اور اتفاق (صفحہ:153)

(27/جنوری 1884ء)

سر سید احمد خان اپنے اس تقریری مقالہ میں بزرگ ہندؤں اور مسلمانوں کی عظمت اور فضیلت پر روشنی ڈالی ہے کہ بزرگوں کی بات یاد کر کے فخر کرنا اور خود کچھ نہ ہونا حمیت کے خلاف ہے بلکہ اپنی جہالت اور کم علمی سے ان بزرگوں کے نام کو بھی خاک میں ملانا ہے۔ سر سید احمد خان اس مقالے میں اس بات پر روشنی ڈالتے ہیں کہ ہر جگہ علم کا چرچا ہو رہا ہے لیکن ہم کو یہ غور کرنا چاہئے کہ کونسا علم ہمیں مفید ہوگا۔ کیونکہ جس چیز کے حاصل کرنے کی ہم کو ضرورت ہے اس کو ہم چھوڑ بیٹھیں ہے۔ یعنی انگلش لینگویج اس وقت کی ضرورت ہے۔ پہلے زمانے میں کتابیں علوم و فنون سے بھری تھی غور کرنے کی بات ہے کہ علوم اور فنون نے کہاں تک ترقی کی۔ یوروپ میں فرنچ زبان اور قریب زمانہ جرمن زبان بھی علوم کے لیے مخزن ہو جائے گی۔ یہ علوم انگلش زبان میں بھی ہے۔ اس طرح ہم اپنی زبان انگلش میں ترقی کر سکتے ہیں۔ اس تقریری مقالہ میں سر سید احمد خان اپنی رائے اور خیال پیش کرتے ہیں کہ کوئی بھی گورنمنٹ ہر ایک قوم کی تعظیم کا ذمہ اپنے اوپر نہیں لے سکتی ہے۔ اور ممکن نہیں کہ گورنمنٹ اپنی تمام رعایا کی تعلیم کر سکے سر سید احمد خان افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہماری قوم کی ہر جگہ یہی خواہش ہے کہ گورنمنٹ اسکول قائم ہو مگر یہ خواہش کسی طرح پوری نہیں ہو سکے گی کیونکہ گورنمنٹ کی آمدنی بہ لحاظ اس کے اور مصارف کے کسی قوم کی تعلیم کے واسطے کافی نہیں ہوسکتی۔ اس لیئے ہندوستانیوں کو چاہئے کہ اپنے باہمی چندہ، اپنی قوت بلا مداخلت قوم کی طرف داری یا بہتری کی کوشش نہیں کر سکتی ہے۔ سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ انگریزی گورنمنٹ میں زیادہ عمدگی جو اس میں ہے وہ تعلیم مذہبی سے بالکل علیحدہ ہے۔ سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ ہمارے وطن اور ہم قوم لوگوں کو گورنمنٹ پر بوجھ تعلیم نہیں ڈالنا چاہئے۔ بلکہ

تعلیم کو اپنے بل بوتے پر حاصل کرنا چاہئے۔ گورنمنٹ کا یہ فرض ہے کہ وہ مدد کرے۔ تعلیم کا میدان بہت ہی وسیع ہے مگر ملک کے لوگوں کو اس وقت انگریزی زبان تعلیم کی اشد ضرورت ہے۔ لیکن تعلیم کے ساتھ ہمارے ملک کے نوجوان کو اس بات کو یاد رکھنا چاہئے۔ کہ تعلیم سے تربیت جدا نہیں ہوسکتی ہے۔ یعنی تعلیم ہو تربیت نہیں تو وہ کسی کام کا نہیں۔ سرسید احمد خان لارڈ میکالی کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ گورنر جنرل اور کوئی پیرائے ہندوستان میں ایسا نہیں گزرا جس نے لارڈ میکالی سے زیادہ ہندوستان کو بھلائی پہنچائی ہو۔ اس نے جو کچھ کیا اپنی گورنمنٹ کی خیر خواہی اور بھلائی کے لئے کیا مگر اسی کے ساتھ اصلی خیر خواہی اور بھلائی کی اصلی جان علم کا درخت کا بیج ہے اُسی نے بویا ہے سرسید احمد خان قوم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ کسی لڑکے کا وقت اسکول میں گزرتا ہے اور وہ تعلیم پاتا ہے تو باقی کا حصہ جو اپنے گھر میں گزارتا ہے وہی تربیت کہلاتی ہے۔ اسی طرح سے تربیت کے بغیر تعلیم بے فیض اور بے معنی ہے۔ سرسید احمد خان کہتے ہیں کہ قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے یوروپین، افغانستان اور ایرانی مختلف خیالات اور مذاہب کے ہیں۔ مگر سب ایک قوم میں شمار ہوتے ہیں اسی طرح ہندو اور مسلمان دونوں ہندوستان ملک کے رہنے والے ہیں تو اس اعتبار سے ایک ہی قوم ہیں۔ اور ملکی فائدہ سب کو برابر ہونا چاہئے۔ اور جو چیز نہایت عمدہ اور خوب ہے وہ اتفاق ہی ہے۔ آخر میں سرسید احمد خان اپنے تقریری مقالہ میں کہتے ہیں باہم اتفاق کے ذریعہ سے قومی تعلیم اور تربیت حاصل کرنا چاہئے۔

اتحاد باہمی اور تعلیم (صفحہ:163)

(29/جنوری 1884ء)

سرسید احمد خان اپنے تقریری مقالہ میں کہتے ہیں کہ ہندوستان ایک ایسا ملک ہیں جس میں لوگ تعلیم اور علم کو نہ جانتے ہو۔ یہ نہایت قدیم اور پرانا با مقدس ملک ہیں۔ ہمارے اسلاف وہ

لوگ تھے۔جنہوں نے علم کو بہت ترقی دی۔اگر ہمارے اسلاف یونانی علوم کو زندہ نہ رکھتے تو آج تمام علوم دنیا میں کوئی بھی یعنی فلسفہ اور یونانی لا جک کا ایک حرف نہ جانتا۔سر سید احمد خان اپنے مقالے میں اس بات پر بھی روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارے ملک کے دونوں قوموں کی حالت ہے کہ مذہب کے نام پر شیخی کرتے ہیں۔اور خود کچھ نہیں کرتے، زمانہ روز بروز ترقی کرتا جاتا ہے۔گو یوروپ ہمارے علوم سے روشن ہوا مگر انہوں نے علم کو جانچا اور پڑھا اور علم کو ایسی ترقی دی جیسے ایک بیج سے عالی شان درخت پیدا ہوتا ہے۔سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ جب علوم نے اتنی ترقی پائی تو ہمارا فرض ہے کہ ان علوم پر نظر ڈالیں اگر پرانے علم کو رٹتے رہیں گے ہم مثل ایک جانور کے ہوں گے۔جو وہی کام کرتا ہے جو اس کے دادا پردادا کرتے تھے۔ہمیں جدید علم کو سیکھنا چاہئے۔جس میں روز بروز ترقیاں اور کارآمد چیزیں موجود ہے۔سر سید احمد خان کہتے ہیں میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہندو سنسکرت کو یا مسلمان عربی زبان کو چھوڑ دیں۔اس زبان میں ہمارے مذہب کی ہدایتیں ہے لیکن جب کہ ہمارے معاش، بہتری اور ہماری زندگی آرام سے بسر ہونے کے وسائل انگریزی زبان میں ہیں تو ہمیں اس کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔گورنمنٹ کی حکومت میں مختلف فرقے اور مختلف مذاہب کے لوگ ہوتے ہیں۔ان کے مختلف اغراض ہوتے ہیں گورنمنٹ ہر خالص فرقے کے واسطے بندوبست تعلیم نہیں کرسکتی ہے۔اس کا اصول کُل کے ساتھ مساوی برتاؤ ہوگا۔لیکن جب تک ہم خود اپنی تعلیم اپنے بچوں کی تعلیم اپنے ہاتھ میں نہ لو تم دونوں قسم کی تعلیم ان کو نہیں دے سکتے۔علم صداقت سکھانے، اخلاق درست کرنے، زندگی کی راہ بتانے، ابنائے جنس کے ساتھ صبر کرنے، اپنے اور دوسرے کے حق کو پہنچانے میں کارآمد ہے۔

اور جو اصول ہماری برٹش گورنمنٹ کے حکومت کرنے کے ہیں ان کے سمجھنے میں غلطی کرنا تعلیم نہ ہونے کا نتیجہ ہے۔سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ علوم جدیدہ پر ہمارے پرانے بزرگ یہ شبہ

کرتے ہیں کہ انگریزی تعلیم اورعلوم جدیدہ کے سیکھنے سے مذہب جاتا رہتا ہے۔اس بات پر میں یقین اور سچے دل سے کہتا ہوں کہ کوئی بھی علم فلسفہ نیچرل،فلاسفی یا کسی علم کا نام لو مذہب کے خلاف نہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ خدا کوایک اوررسول کو برحق جانیں قرآن برحق کی خوبیوں پر یقین رکھیں۔ اسی کے ساتھ نئے علوم کو سیکھیں۔اس سے دین اور دنیا دونوں بنتی ہے سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ تربیت کے بناء تعلیم کچھ نہیں ہے۔تعلیم وتربیت کے ذریعہ ہی انسان میں انسانیت پیدا ہوتی ہے۔ ادب عزت کا باعث ہے لیکن ادب کو یہ سمجھنا کہ بڑوں کو دیکھ کر جھک کر سلام کرنا،ڈر سے سچی بات نہ کہنا،ایسے ادب سکھانے سے اولاد کے اندر جرات، دلیری اور شرافت کھو دیتی ہے۔انہیں جھوٹ بولنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ جب بڑے ہو جاتے ہیں تو دل کی سچائی ظاہر کرنے سے رک جاتے ہیں۔سرسید احمد خان اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آزادی اور بے ادبی میں تمیز کرنا چاہئے۔ یہ دو الگ چیزیں ہیں اصلی ادب کے ساتھ آزادی کا کام میں لانا باعث فخر ہے۔ سرسید احمد خان اپنے تقریری مقالے کے آخر میں باہمی اتحاد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہندوستان میں موجود تمام قوموں کو آپس میں اتفاق اور دوستی پیدا کرنی چاہئے۔مختلف مذاہب کے لوگوں کو یہ خیال ہرگز نہیں کرنا چاہئے کہ باہمی اتفاق نہیں ہوسکتا۔ ملک کے باشندوں کو ملک کی بہتری کے لیے ایک جان ہو کر کوشش کرنا چاہئے۔اگر ایسا نہ کرو گے تو ہندو اور مسلمان دونوں قومیں ڈوبیں گی۔ یہ ملک وکٹوریہ ایمپریس آف انڈیا کے امن کا زمانہ ہے اس میں متفق ہو کر جس طرح چاہو ترقی کر سکتے ہو۔

مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے تاریخی حالات (صفحہ:184)

(ڈسمبر1889ء)

سر سید احمد خان اپنے مقالے میں اس بات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ مدرستہ العلوم علی گڑھ ایک بہت بڑا تعلیمی ادارہ ہے جو قوم کی تعلیم کے لیے قائم ہوا ہے۔اس تعلیمی ادارہ کے تاریخانہ حالات اور جدید واقعات سے قوم کو واقف کرواتے ہیں سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ غدر کے بعد مجھ کو اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا نہ مال واسباب کا۔ جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا۔اسی زمانے میں، میں نے ایک رسالہ قوم کی بے گناہی کا لکھا۔ جو کاز آف انڈین رولٹ کے نام سے موسوم ہوا۔اسی زمانے میں چند رسالے بھی لکھے۔ جو دلائل محمدنز آف انڈیا سے مشہور ہیں۔سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ جب میں نے قوم کی مصیبت کا اصلی سبب سونچا تو جواب ملا۔قوم میں تعلیم و تربیت نہیں تھی۔اول 1858ء میں ایک اسکول مرادآباد میں قائم کیا۔سر جان اسٹریچی کی مہربانی سے وہاں اور ایک اردو، انگریزی اسکول قائم ہوا۔اور دونوں کو ملا دیا گیا۔ پھر غازی پور میں اسکول کی بنیاد ڈالی تاکہ وہاں اردو، عربی، فارسی، انگریزی پڑھائی جائے۔ جو وکٹوریہ اسکول کے نام سے موسوم ہے۔ 1864ء میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ پھر مجھے موقع ملا کہ لندن جاکر تعلیم و تربیت کے ان طریقوں سے واقف ہوں جن سے انگلش قوم نے ایسی اعلیٰ درجہ کی ترقی کی ہے۔ وہاں جاکر دیکھا کہ ہماری قوم تاریک کے ایسے گڑھے میں گری ہوئی ہے۔جس سے نکلنا محال معلوم ہوتا تھا۔مگر میں نے ہمت نہیں ہاری ہندوستان پہونچ کر تہذیب الاخلاق جاری کیا۔اس کی مخالفت ہوئی۔1872ء میں چندہ جمع کر کے بنارس میں ایک کمیٹی محمڈن اینگلواورینٹل کالج فنڈ بنائی گئی۔اس کمیٹی میں تجویز پیش کی گئی کہ مدرسہ کہاں بنایا جائے بلاآخر 8/نومبر 1872ء کی اجلاس میں یہ فیصلہ ہوا کہ مدرسہ علی گڑھ میں بنایا جائے۔19/مارچ 1874ء کے اجلاس میں سکریٹری

نے اطلاع دی کہ گورنمنٹ نے اُس زمین کو دینے کا وعدہ کرلیا ہے جہاں مدرسہ العلوم کا تعمیر ہونا تجویز کیا گیا ہے۔ 25 ؍فروری 1875ء کے اجلاس میں بنارس کی کمیٹی نے علی گڑھ میں ابتدائی تعلیم کے لیے مدرسہ کھولنا تجویز کیا۔ میں اس تجویز کا بالکل موید تھا۔ مدرسہ کھولا گیا۔ 1878ء میں ایف۔ اے تک اور 1881ء میں بی۔ اے اور یم۔ اے پڑھائی تک ترقی کر گیا۔ اس کے لیے خاص علی الخصوص پنجاب کے زندہ دل بزرگوں دیگر امراء ورئیسا اور بالتخصیص اسلامی سلطنت حیدرآباد نے جو امداد کی ان تمام کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ہمارے یوروپین دوست مسٹر ویٹ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن نے صلاح دی کہ کالج کی اب ایسی حالت ہوگئی کہ اس کے لیے باضابطہ کمیٹی مقرر کرنا اور تمام کاروائی کے لیے ایک مکمل کوڈ بنانا ضروری ہے۔ ممبروں کے اجلاس منعقدہ 11؍ مارچ 1881ء کو اس امر کو پیش کیا اور اس کوڈ لاء اور ریگولیشن بنانے کی اجازت لی۔ کمیٹی نے منظوری دے دی۔ سرسید احمد خان اس مقالے میں اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ 19 ؍مارچ 1874ء میں بلا کسی شرط وقید کے مجھ کو تعمیری عمارت کی اجازت دی۔ اس وقت سے آج تک میں اپنی رائے اپنی مجوزہ نقشہ جات کے مطابق کام کرتا ہوں کسی ممبر یا کمیٹی نے کبھی دخل نہیں دیا۔ آج جو آپ کالج اور بورڈنگ ہاؤس کی عالی شان عمارتیں جن کو دیکھ کر نہ صرف ہندوستان کے لوگ بلکہ یوروپ اور امریکہ کے سیاح بھی حیران رہ جائے۔ جو محنت اور شفقت سے میں نے کی ہیں۔ لوگوں کو یہ غلط خیال پیدا ہوگیا ہے کہ کالج نے بہت سا روپیہ جمع کرلیا ہے اور اس کے پاس اتنا سرمایہ ہے کہ کالج بغیر تکلیف اٹھائے چل سکتا ہے جبکہ ان کا خیال بالکل غلط ہے۔ کالج کے پاس بجز قلیل بلکہ نہایت قلیل سرمایہ کے کوئی فنڈ، اسکالرشپ یا وظیفوں کے لیے نہیں ہے۔ دوستوں سے اس لیے سوال کرنا پڑتا ہے۔ پھر آئندہ سال کی فکر لگی رہتی ہے سرسید احمد خان کہتے ہیں کہ ان تمام مشکلات کو حل کرنے اور سامان مہیا کرنے پر ہمارے دوستوں کو کوشش کرنی

چاہئے۔اس کے بجائے یہ کہتے ہیں کہ یورپین اسٹاف کا خرچ بڑھادیا ہے۔اس پر صرف اتنا کہوں گا کہ جس مقصد سے کالج کو قائم کیا گیا ہے۔ممکن نہیں ہیں کہ بغیر عمدہ اور معزز اسٹاف کے ہم اپنی قوم کو معزز بنا سکیں۔سب سے زیادہ مشکل کام جو بالفضل کالج میں ہے۔وہ یوروپین اسٹاف کا ولایت سے بلانا۔اور کالج میں رکھنا کیونکہ کالج ان کو اس قدر تنخواہ نہیں دے سکتے۔جس قدر یورپین افسروں کو گورنمنٹ یا ایڈڈ کالجوں سے ملتی ہے اور ہمارے کالج سے ان کو ترقی کی امید ہے۔ اور نہ پنشن کی۔ایسے یوروپین افسروں کی ضرورت تھی جو پستی کی حالت سے نکال کر علم کی ترقی کے درجے تک پہونچائے۔میں نہایت خوشی اور فخر سے کہتا ہوں کہ کل موجودہ یوروپین اسٹاف یہی احساس رکھتا ہے۔اس کے بعد کالج ترقی کرتا چلا گیا۔سرسید احمد خان کہتے ہیں کہ یہ سوچنا میرا فرض تھا کہ میرے بعد اس کا کالج کا کیا حال ہوگا۔سب خدا پر چھوڑ دو یہ بڑے دین داروں کا کام ہے۔میں تو ایک آدمی ہوں۔پس اقرار کرتا ہوں کہ کالج کے تمام کاموں کو انجام دینے کی لیاقت مجھ میں نہیں تھی۔تمام کام سید محمود کے مشورے پر ہوتے تھے۔جب میں نے فیصلہ کیا کہ میرے بعد لائف آنزیری سکریٹری مقرر کروں۔لیکن اس کی تجویز کی ایسی مخالفت ہوئی کہ جس نے اشخاص کو بلکہ قوم کو بدنام کیا۔رسالے اور اخبارات اور پمفلٹ مخالفت کے چھپے۔سب کا ماننا تھا کہ سید محمود کا جوائنٹ سکریٹری ہونا جائز ہے کیونکہ انہوں نے شروع سے اس مدرسے میں آپ کی مدد کی ہے۔مگر لائف جوائنٹ سکریٹری ہونے کا استحقاق وضرورت نہیں ہے۔ان تمام پر کامل غور کرنے کے بعد میں مسودہ قانون بنایا۔بلاشبہ سید محمود کالج فنڈ کمیٹی کے ممبر بھی ہے۔اور خود کمیٹی کے قواعد بنانے اور کل ممبروں کے سامنے پیش کرنے کا حق رکھتے ہیں۔مسودہ کے بنانے میں شریک غالب تھے اور مسٹر اسٹریچی بطور لیگل ایڈوائزر کے شامل تھے۔ہر ممبر کے پاس جب میں نے رائے طلب بھیجا تو میری نسبت کہا گیا کہ میں ترقی اور تقسیم مسودہ قانون ٹرسٹیان میں بے ضابطگی کی ہے۔مگر

میں سمجھتا ہوں کہ میں نے ضرورت سے زیادہ احتیاط کی ہے سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ جن لوگوں نے ہر ایک امر میں اختلاف کرنے کا ارادہ کرلیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بورڈنگ ہاؤس کی نگرانی بجز مسلمان ممبر کے کسی کو نہ دی جائے۔ بورڈنگ ہاؤس میں یونین کلب جس میں تقریری اور مباحثہ کرنا سکھایا جاتا ہے۔ کرکٹ کلب میں کرکٹ کی مشق کروائی جاتی ہے۔ امپوزیشن یعنی معیاد، معین تک ایک جگہ بیٹھ کر پڑھنے لکھنے کی سزا دی جاتی ہے۔

جب سے میرے اور مسلمانوں کی قوم کے دوست مسٹر بک پرنسپل نے اپنی مہربانی سے بورڈنگ ہاؤس کی نگرانی اپنی ذمہ لی ہے۔ بورڈنگ ہاؤس کا ایسا عمدہ انتظام کیا ہے جو کسی وقت میں نہ تھا۔ ہر کام ڈسپلن سے ہوگیا ہے نماز کی پابندی بہت ہوگئی ہے۔ جو کسی زمانے میں نہ تھی۔ یہ سب پرنسپل بک کی محنت اور کوشش کا نتیجہ ہے۔ سر سید احمد خان اس بات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں کہ کالج قائم کرنے کا سب سے بڑا مقصد مسلمانوں اور انگریزوں میں دوستانہ راہ اور رسم پیدا ہو اور آپسی تعصب ونفرت دور ہو۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں کسی حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ کسی قدر گزشتہ زمانے کی تاریخ میں یہ توبہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے فیاضی بزرگ ایسے گزرے ہیں جنہوں نے مذہبی کاموں میں بہت کچھ فیاضی کی ہے۔ مکانات، روپیہ، دوکانیں، دیہات وجاگیریں، مسجدیں، خانقاہیں، چھوڑی ہیں مگر وہ اب ایسی خراب حالت میں ہے اور ان کی جائیدادیں اس طرح تلف ہوگئی ہے۔ خیرات کرنے والوں کی روحیں بھی افسوس کرتی ہونگی۔ آخر میں سر سید احمد خان اس مقالے میں کہتے ہیں کہ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ایک ایسا بڑا تعلیمی ادارہ قوم کی عیانت سے قوم کی بھلائی کے لیے قائم ہوا ہو۔ سر سید احمد خان مقالے کے آخر میں کہتے ہیں کہ کالج سے کوئی میری ذاتی غرض بجز اس کے کہ میں نے قومی بھلائی بہتری اور ترقی کیلئے کہا ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ جس امر میں اختلاف ہوا۔ جب وہ یک سو

ہوجائیں گے۔تو پھر آپسی میں متفق ہوجائیں گے اور سب مل کر کالج کی بہتری کی کوشش کریں گے۔

موجودہ تعلیم (صفحہ:246)

(27/ڈسمبر 1894ء)

سرسید احمد خان اپنے تقریری مقالے میں گزشتہ زمانے میں موجود بزرگوں کی حالت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان میں اخلاق، محبت، مروت، دوستی، فیاضی چھوٹوں سے الفت، بڑوں کا ادب، غریبوں کے ساتھ ہمدردی قومی یگانگت۔سب ان میں موجود تھی۔قومی تعلیم دینی یا دنیاوی کا ایسا مستحکم اور قابل ادب سلسلہ تھا۔جس کی نظیر تمام دنیا کی کسی قوم میں پائی نہیں جاتی۔انقلابات زمانہ میں نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ لوگ رہے۔جن کی محبت سے ہم لوگ تربیت پاتے تھے۔سرسید احمد خان کہتے ہیں کہ غدر 1857ء کا الزام بدقسمتی سے مسلمانوں پر لگایا گیا تھا تب سے رہا سہا جو کچھ تھا برباد کر دیا۔اس کا اثر ہندوستان پر پڑا۔سرسید احمد خان جلسے میں آئے تمام لوگوں سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ اس وقت یہاں لوگ مختلف ملکوں کے حصوں سے خاندانوں سے قبیلوں سے آئے ہوئے ہیں تو آپ سبھی یہ غور کریں اور دیکھیں کہ اب ایسے بزرگ کس مقام اور کس خاندان میں باقی ہے۔جن کی نیک صحبت کے اثر سے ہمارے نوجوان اور بچے تعلیم و تربیت پاسکیں۔سرسید احمد خان انسان کے قواء کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب قواء ضعیف ہوجاتے ہیں۔تو اعتدال مزاج درہم برہم ہوجاتے ہیں۔اور وہ متعدد بیماریوں میں مبتلا ہوجاتا ہے۔یہی حال قوم کا ہوتا ہے۔جب اس کو تنزل ہوتا ہے تو کسی ایک چیز میں تنزل نہیں ہوتا بلکہ مذہب، اخلاق، تعلیم، راست بازی، دولت، دیانت داری، سب چیزوں میں تنزل ہوتا ہے۔اور جو لوگ اس کی اصلاح میں ہوتے ہیں وہ سوچتے ہیں کہ کس کس چیز کا علاج کریں۔مگر جب غور کیا جاتا ہے تو بجز تعلیم و تربیت کے اور کوئی اس کا علاج نظر نہیں آتا۔سرسید احمد خان کہتے ہیں کہ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ

دنیاوی علوم دینا چاہئے۔ کیونکہ دنیاوی علوم کے بغیر ہمارے قوم دنیا میں رہنے کے قابل نہیں۔ سر سید احمد خان اس بات پر بھی روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک زمانہ میں جاہل عرب تجارت میں مشہور تھے۔ لیکن اس زمانے میں تجارت جاہل بدوؤں کا کام نہیں رہا۔ وہ ایک نہایت اعلیٰ درجے کا فن ہوگیا ہے۔ جس میں تعلیم وتربیت، عمل وعلم دونوں کی ضرورت ہے۔ مگر ہماری قوم سے یہ سب چیزیں معدوم ہوگئی ہے۔ سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ ہماری قوم میں سپاہانہ جرأت اور دلیری نہیں رہی ہے اگر ان میں کچھ ہے تو نامہذب اکھڑ پن ہے۔ سر سید احمد خان اپنے تقریری مقالے میں دو لفظ اپنے کالج کے لڑکوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ ائے طالب علموں مجھے تم سے جو توقعات ہیں اگر اُسے تم پورا نہ کرسکو گے تو افسوس تم پر مجھ پر اور قوم پر۔ لوگ شکایت کرتے ہیں کہ انگریزی تعلیم سے طالب علموں کی عادات اخلاق خراب ہوجاتے ہیں۔ لیکن میں اپنے طالب علموں کو ایسا نہیں پاتا ہو نہایت مہذب اور بزرگوں اور استادوں کا ادب کرنے والے ہیں۔ ''جو مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کرتا ہے وہ مذہبی عقائد ادا کرنے میں سست ہوجاتے ہیں۔'' اس بات پر سر سید اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو نوجوان مسلمان انگریزی خواں نہیں ہے۔ وہ بھی فرائض مذہبی ادا کرنے میں کچھ چست نہیں ہوتا ہے۔ سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ اس تقریر کا مقصد بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ جو حالات قوم کے ہے وہ آپ کے سامنے بیان کروں کہ جب تک ہماری قوم، علماء اس پر متوجہ نہ ہوں کچھ نہیں کر سکتے۔ ہمیں سوچنا چاہئے کہ ہمارے اختیار میں کیا ہے۔ طالب علموں کو روزہ، نماز پڑھنے کی تاکید کے علاوہ کسی لائق عالم کو ان کی نصیحت اور اُن کے امور دینی کی حفاظت کے لیے مامور کریں۔ مذہبی تعلیم کو جس قدر ہو سکے اس تعلیم میں داخل کریں۔ جسے ان کے لباس صاف ستھرے ہو، سلیقے سے کھانا اور رہنا۔ سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ بعض لوگوں کی رائے اس کے برخلاف ہے وہ کہتے ہیں کہ ایسی مہذیب عادتیں طالب علموں میں نہ ڈالی جائے۔ کیونکہ فارغ کالج ان کی قسمت میں قلی کے طور پر رہنا ہو تو وہ کیسے اچھی

طرح کیوں کر رہ سکیں گے۔اس پر سر سید احمد خان اپنے رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ اس طریق سے کوئی قوم مہذب قوم نہیں بن سکتی۔ جو لوگ ایسی تعلیم دینا چاہتے ہیں ان کو مناسب ہے کہ خیراتی اسکول و کالج کھولیں۔ان کو اپنے اولاد پر روپیہ خرچ کرنے کی عادت نہیں ہے۔اس کے بجائے فضول اخراجات ورسومات پر خرچ کرتے ہیں۔ جب تک یہ فضول خرچی بند نہ ہوگی اور اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت پر خرچ نہیں کریں گے تب تک نہ تو اولاد کی تعلیم ہوسکتی ہے اور نہ تربیت۔آخر میں سرسید احمد خان اپنے اس تقریری مقالے میں کہتے ہے کہ اپنی فرصت کے اوقات میں سوچیں کہ قوم کو ایک معزز قوم بنانے اور اُن تعلیم وتربیت کرنے کی کیا تدبیر ہے۔اور جو بہتر سمجھیں ویسا کریں۔

ترقی کے اصول اور تنزل کے وجوہ (صفحہ:265)

(دسمبر 1896ء)

سرسید احمد خان اس مقالہ میں قابل ادب بزرگوں کا مقولہ پیش کرتے ہیں کہ ''وہ قوم نہایت بدنصیب ہے جس کی گزشتہ زمانے کی تاریخ قابل یاد رکھنے کے ہو اور اس کو یاد نہ ہو۔اور وہ قوم نہایت خوش نصیب ہے جس کی گزشتہ زمانے کی تاریخ یاد رکھنے کے قابل اور قوم نے یاد رکھا ہے۔اس مقولہ کے ذریعہ سرسید کہتے ہیں کہ ہماری قوم کی گزشتہ زمانے کی تاریخ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔لیکن جب ہم خود نالائق و ناخلف ہے تو ہم کو اپنے بزرگوں کی شان وشوکت پر فخر کرنے سے کیا فائدہ ہے۔ہمیں چاہئے کہ موجودہ زمانے کے حالت پر غور کریں اور اپنی قوم کو بھلائی میں کوشش کریں۔سرسید احمد خان اپنی تقریری مقالے میں اس بات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں کہ ہم کو اس حکومت پر غور کرنا چاہئے جو امن وامان اور جانی اور مالی اور مذہبی آزادی انگریزی حکومت میں حاصل ہے۔اس سے بہتر اور عمدہ کسی عہد کے کسی زمانے میں دیکھنے کو نہیں ملی۔ کیونکہ زمانہ سابق کے مظالم کا وجود نہیں رہا ہے ہر کوئی ترقی کرسکتا ہے۔ایک جگہ سے دوسری جگہ جا سکتا ہے۔ دوسری جگہ کی خبریں بھی حاصل کرسکتا ہے۔پس امر پچھلے زمانے میں بادشاہوں کو بھی نصیب نہ تھا وہ آج

ادنیٰ آدمی کو میسر ہے۔اس لیے ہمیں اس وقت کی قدر کرنی چاہئے۔سرسید احمد خان اس مقالے کے ذریعہ نصیحت کرتے ہیں کہ اس وقت کو غنیمت جانو اور اپنی قوم کی بھلائی میں ترقی کی کوشش کرو۔اس مقالے کے ذریعہ سرسید احمد خان اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسلمان تنزل کی حالت میں ہے اُن کو ترقی کرنی چاہئے۔سرسید احمد خان کہتے ہیں کہ بزرگان دین سمجھتے ہیں کہ مذہبی تعلیم کو بہت تنزل ہوگیا ہے اور مذہبی پابندی کم ہوگئی ہے۔لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دنیاوی حالت میں بھی اگر مسلمانوں کی بری حالت ہوجائے گی تو خود اسلام کی بھی رونق جاتی رہے گی۔پس دنیوی ترقی کے ساتھ جب کہ وہ نیکی اور ایمانداری سے کی جائے۔اسلامی ترقی بھی لازم وملزوم ہے۔سرسید احمد خان اپنے تقریری مقالے میں قوم کے تمام حالات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ قوم میں تعلیم کی نہایت کمی ہے۔اور جب تک قوم میں تعلیم نہیں پھیلتی اور ان کی دماغی اور ذہنی قوتوں کو ترقی نہیں دی جاتی اُس وقت تک کسی قسم کی ترقی قوم کو نہیں ہوسکتی۔خواہ وہ ترقی صنعت وحرفت میں ہو یا تجارت میں ہو۔سرسید احمد خان مقالے میں اس بات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔جو زبان ملک میں حاکم کی ہوتی ہے۔اُسی زبان کے ذریعہ علوم کو حاصل کرنا ہوتا ہے اس طرح سے انگریزی زبان میں ہمیں بھی علوم حاصل کرنا ہوگا۔سرسید احمد خان اپنے مقالے میں افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قوم کو قومی تعلیمی وترقی اور فلاح کا خیال نہیں ہے اور اپنی اولاد کی تعلیم میں بھی روپیہ خرچ کرنے کی عادت نہیں ہے۔پہلے زمانے میں طریقہ تعلیم بالکل مختلف ہوتا تھا۔اس زمانے میں طالب علم مسجدوں،خانقاہوں کے حجروں میں رہتے تھے۔لیکن اس زمانے میں وہ سادہ اور کم خرچ طریقہ علوم تحصیل حاصل کرنے کا چلن نہیں رہا۔خصوصاً علوم انگریزی اس طرح حاصل نہیں ہوسکتے۔سرسید احمد خان اپنے قوم کے بزرگوں سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ تم سب مل کر اتفاق سے کام لو تم میں اب بھی وہ طاقت ہے جو ہارون رشید مامون رشید نہ اکبر کو نصیب ہوئی تھی۔اور نہ شاہ جہاں کو۔اور نہ اس زمانے میں باوصف اس جاہ جلال کے

انگریزی گورنمنٹ کو حاصل ہے۔ بہ شرطیکہ تم اپنی آمدنی میں سے تین پائی حصہ اپنی قوم کے لئے دو۔مختلف اور متعدد کاموں کے بدلے کسی ایک کام کو متفق ہو کر تمام کرلو۔ پھر دیکھو کیسے ترقی نصیب ہوگی۔اس کے ساتھ سرسید احمد خان افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم میں استقلال نہیں اگر استقلال ہے تو اتفاق نہیں اس لیے تمام کام خراب اور ابتر ہے بلکہ ہر کام ہر بات میں قومی نکبت کے نشان موجود ہے۔سرسید احمد خان مقالے میں اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ اوہام مذہبی اور تعصّبات ہماری قومی ترقی کے مانع ہے۔اسے ہمیں دور کرنا چاہئے۔جس سے ملک میں امن و امان قائم ہو سکے۔آخر میں سرسید احمد خان اپنی تقریری مقالے میں سر آکلنڈ ن کالون کا قول بیان کرتے ہیں کہ ''آج کل دنیا میں اُسی قدر بت دکھائی دیتے ہیں جتنے کہ 7ویں صدی میں عرب میں دکھائی دیتے تھے۔''

ایک بت یہ ہے کہ لوگ گزشتہ طریقہ تعلیم پر اور اُس زمانے کے دلائل اور بحث و مباحثہ کے طریقے پر از خود رفتہ ہے اور دوسرا ان تمام چیزوں سے جو مذہب اور اسلامی مملکت سے اجنبی ہو متعصّبانہ نفرت رکھتے ہیں۔اور ایک بت جو سب سے خطرناک ہے وہ کاہلی اور لاپرواہی اور غفلت کا ہے۔یہ سارے بت گونگے اور تاریک ہے جن کی شکل سے دہشت ٹپکتی ہے۔اور جو اپنے دعویٰ میں محض بےہودہ ہے اور اپنی کمزوری ادب اثر کے باعث قابل نفرت ہے۔

ترغیب تعلیم انگریزی (صفحہ:285)

6/اکتوبر 1863ء کو مجلس مذاکرہ علمیہ کلکتہ کے ایک اجلاس میں برمکان آنریبل مولوی عبدالطیف خان صاحب کا سرسید نے یہ مقالہ لکھ کر پڑھا جو فارسی میں تھا اور جس میں اس امر کی ترغیب دی گئی تھی کہ مسلمانوں کو اپنے اسلامی اور قومی اور دینی علوم کے ساتھ انگریزی زبان اور اسکے علوم بھی حاصل کرنے چاہئے تاکہ ہم حکمران قوم کے افکار و خیالات سے بخوبی واقف ہو سکیں۔

ماحصل

سرسید احمد خان ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے ان کی پوری زندگی علم وعمل سے عبارت ہے اوران کی خدمات کا دائرہ مختلف جہات پر پھیلا ہوا ہے۔لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے جس کام کا بیڑا اٹھایا اپنے حسن تدبیر سے اسے سدا بہار بنا دیا۔سرسید دہلی کے ایک معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ان کے اسلاف عرب سے بادشاہ شاہ جہاں کے عہد حکومت میں ہندوستان تشریف لائے اور شاہان دہلی کے دربار میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوتے رہے۔سرسید کے والد میر متقی نہایت خدارسیدہ بزرگ اوران کی والدہ نہایت خوش سلیقہ تعلیم یافتہ خاتون تھیں اولاد کی تربیت میں انہیں خاص ملکہ حاصل تھا۔سرسید کے نانا خواجہ فریدالدین احمد مشہور عالم تھے اور علم ریاضی میں انہیں دسترس حاصل تھی۔انکے نانا کا ذاتی کتب خانہ تھا۔سرسید نے اس سے استفادہ کیا سرسید کی تربیت میں ان کی والدہ ماجدہ اوران کے نانا کا نمایاں حصہ ہے۔سرسید کی والدہ عزیز النساء بیگم دوراندیش اور دردمند خاتون تھیں سرسید ابھی کم سن تھے کہ والد محترم کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔لہٰذا ان کی تعلیم وتربیت کی پوری ذمہ داری والدہ پرآن پڑی اورانہیں کی تربیت کے نتیجے میں سرسید کواعلیٰ نصب العین کے تلخ حقائق کا سامنا کرنے کی صلاحیت حاصل ہوئی۔

ابتداء ہی سے سرسید احمد خان کو لکھنے پڑھنے کا ذوق تھا۔زبان وادب اور فلسفہ کے علاوہ انہیں علم ریاضی اور تاریخ سے گہرا شغف تھا۔انہوں نے کم عمر ہی میں بڑے شوق وذوق کے ساتھ لکھنا پڑھنا شروع کر دیا۔اور سترہ برس کی عمر میں وہ اپنے بھائی سید محمود خان جو دہلی سے سید الاخبار پرچہ 1835ء میں جاری کیا تھا اوراسی سال اخبارات کوآزادی ملی تھی۔اس میں مختلف مضامین لکھنے اور ایڈٹ کرنے لگے تھے۔اس طرح سے سرسید احمد خان کی سب سے پہلی علمی وادبی خدمات اخبار میں مضمون نویسی کے ذریعہ ہوئی تھی۔اور بہت جلد ملک کے ایک اہم مقالہ

نگار بن گئے۔ انہوں نے اپنی ملازمت کا آغاز عدالت کی سر رشتہ داری سے کیا بعد میں منصبی کا امتحان پاس کیا اور دہلی میں مصنف کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ ملازمت کے دوران بھی تصنیف و تالیف کا سلسلہ برابر جاری رہا۔جن میں آثارالصنادید، آئین اکبری، تفسیر القرآن، رسالہ اسباب بغاوت ہند اور تبین الکلام کے علاوہ بہت بڑی تعداد میں ان کے مضامین، خطوط، رسائل، علمی خدمات اور دوسری تحریروں نے اُردو کے دامن کو وسعت دی ہے۔سرسید کی یہ تحریریں بلامبالغہ اردو دوست اشخاص کے لیے سرمایہ افتخار ہیں۔

سرسید احمد خان ایک بلند پایہ مفکر، مصلح قوم تعلیم کے مبلغ اور علمبردار تھے۔ وہ حصول علم کو عبادت کا درجہ دیتے تھے۔ 1857ء کی شورش کے بعد ہندوستانی عوام بطور خاص مسلمانوں کو جن حالات و مشکلات کا سامنا کرنا پڑھ رہا تھا سرسید احمد خان اس کے عینی شاہد تھے ان کی دورس نگاہوں نے اس کا مداوا عصری تعلیم کے حصول اور انگریزی حکومت سے مفاہمت کی صورت میں تلاش کرلیا تھا۔اوران مقاصد کی تکمیل کے لئے عملی اقدام کی صورت میں انہوں نے علی گڑھ میں مدرستہ العلوم قائم کیا۔ یہی وہ ادارہ ہے جو ترقی کر کے آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا میں شہرت رکھتا ہے۔

سرسید احمد خان نے مسلمانوں کے لئے کچھ اس طرح کا اصلاحی کام کیا اور بے جا رسمیں جو مسلم معاشرے میں پھیلی ہوئی تھیں ان پر پابندی لگانے کی کوشش کی۔ وہ بھی راجہ رام موہن رائے کی طرح اس خیال کے حامی تھے کہ بغیر انگریزی تعلیم حاصل کئے اور سائنسی علوم کو فروغ دیئے بغیر معاشرے کی فلاح و بہبود ممکن نہیں۔ اسی لیے انہوں نے جابجا اسکول کھلوائے اور علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کروایا۔ سائنٹفک سوسائٹی بنائی جس کے ممبر اعلیٰ تعلیم یافتہ اور تہذیب یافتہ ہندو مسلمان دونوں قوم کے لوگ تھے۔ انہوں نے ساری زندگی اس بات پر صرف کردی کہ

لوگ انگریزی زبان لکھا اور پڑھا کریں۔تب ہی مسلمان دنیا کی دوسری قوموں کی برابری کر سکتے ہیں اس کام میں ان کو بڑی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ان کے ساتھی اکثر ان کے راستے کی رکاوٹ بن جاتے تھے۔علماء میں سے چند ایک نے ان پر کفر کا فتویٰ بھی لگایا۔کچھ ان کو غیر مذہبی بھی کہنے لگے تھے۔پھر بھی سرسید اپنے ارادہ ہائے پر اٹل رہے۔اور مسلمانوں کی تعلیمی ومعاشرتی اصلاح کا کام مرتے دم تک کرتے رہے۔

تہذیب وتمدن کے سلسلے میں سرسید احمد خان نے بار ہا اپنی تقریروں میں کہا ہے کہ ''تمام قوموں نے برے بڑے دانشمندوں نے اس بات کا قطعی فیصلہ کر دیا ہے کہ قومی ترقی ،قومی تعلیم پر منحصر ہے۔بس اگر ہم اپنی قوم کی بھلائی چاہتے ہیں تو قومی تعلیم اور قوم کو علم وہنر سکھانے کی کوشش کریں۔'' سرسید انسان میں تہذیب وتمدن اور، دوراندیشی پیدا کرنا ہی سب سے بڑا مقصد سمجھتے تھے۔زندگی کے آخری لمحات میں بھی سرسید کی یہی کوشش رہی کہ ہندوستانیوں میں فروغِ علم ہو اور وہ اپنی تہذیب وتمدن اور تعلیم کے بل بوتے پر ترقی کی منزلیں طئے کریں وہ مسلمانوں کی پسماندہ حالت دیکھ کر نہ صرف تعلیم ہی کی طرف ان کو رجوع کرنا چاہتے تھے ان کا پختہ یقین تھا کہ جب مسلمانوں میں تعلیم عام ہوگی تو وہ خود وقت کی نزاکت اور سیاست کو سمجھنے کے اہل ہو جائینگے۔اور اس وقت وہ صحیح رہنمائی کرنے کے زیادہ موقف ہوں گے۔ وہ ہمیشہ یہی چاہتے تھے کہ مسلمان تعلیمی ،تمدنی، سیاسی ،سماجی اور معاشرتی تمام میدانوں میں دوسری قوموں کے ہم پلّہ ہو جائیں۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ سرسید کی زندگی اور کارناموں کے بہت سے پہلو ہیں۔انسانی زندگی کی تمام حاجتوں اور ضرورتوں کا کوئی میدان ایسا نہیں تھا جس میں سرسید احمد خان نے مسلمانوں کی رہنمائی نہ کی ہو۔سیاست سے لے کر ادب، سائنس، فلسفہ، تاریخ، مذہب حتیٰ کہ روزمرہ کے اخلاقیات وغیرہ کی بہتری کیلئے انہوں نے مسلمانوں کی رہنمائی کی ہے۔

مضمون نویسی سرسید احمد خان بہت زیادہ محبوب مشغلہ رہا ہے اور اس سلسلے میں بڑا سکون ا وطمینان حاصل کرتے تھے۔ بہ قول سرسید نے کہا ''تصنیف و تالیف میں میرا جی لگتا ہے یہ ایسا کسی اور کام میں نہیں لگتا۔''

سرسید احمد خان اپنے دور کے بڑے مضمون نگار اور سب سے اعلیٰ مقالہ نویس تھے۔ ان کی بے شمار تحریریں ادبی، تاریخی، سوانحی، اخلاقی، ثقافتی، سیاسی اور تنقیدی جو اُن کے مختلف رسالوں اور اخباروں اور اُن کے مکتوبات میں پائی جاتی ہے ان کے مطالعے سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن موضوعات کے متعلق انہوں نے لکھا ہے وہ مناسب اور موزوں تھا۔

سرسید احمد خان کی تقریباً چار درجن مطبوعات جس میں سے بعض اُن کی عالمگیر شہرت و مقبولیت کا سبب بنیں۔ جن میں اُن کی تالیفات، تراجم اور رسائل وغیرہ شامل ہیں۔ بطور خاص آثار الصنادید 1847ء اور 1854ء، سرکش ضلع بجنور 1858ء، اسباب بغاوت ہند 1859ء مسافران لندن 1869ء اور لندن میں لکھی گئی خطبات احمدیہ 1870ء قابل ذکر ہیں۔

مستقل موضوعات پر لکھی گئی کتابوں اور تراجم سے کہیں زیادہ دلچسپ اور سرسید احمد خان کی خداداد ذہانت کے موضوعات پر لکھے گئے ان کے وہ مضامین ومقالات ہیں۔ جو بڑی پابندی کے ساتھ تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئے۔ سرسید کے بیشتر مضامین میں چند بے حد مقبول ہیں اور جنہیں آج بھی بڑے شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ وہ مندرجہ ذیل ہے۔

تعصب، تعلیم وتربیت، کاہلی، مخالفت، خوشامد، بحث وتکرار، سویلیزیشن، اپنی مدد آپ، سمجھ، گذرا ہوا زمانہ، امید کی خوشی، رسم ورواج کے نقصانات، عورتوں کے حقوق اور آخری پرچہ تہذیب الاخلاق وغیرہ۔ ان مضامین میں ایک اہم اور قابل ذکر خوبی جو ان کی جامعیت ہے۔ یہ وہ خوبی ہے جسے سرسید کے مغربی ادبیات کے ادراک کا غماز کہا جاسکتا ہے۔

سرسید احمد خان کی مضامین و مقالات مسلمانوں کی ہمدردی سے لب ریز ہوتے ہیں جس میں دکھاوا نہیں ہوتا ہے۔ ان کی عبارت دل نشین اور موثر ہوتی ہے۔ جو موضوع اور اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کے لئے مناسب پیرایہ بیان کرتے ہیں۔ ان کے مضامین کا اور ایک اہم وصف یہ ہے جس میں قوم کی فلاح و بہبود کے جذبات کی ترجمانی بھرپور طور پر نظر آتی ہیں۔

سرسید احمد خان نے ہمیشہ اپنے مضامین میں زیادہ زور اس بات کی طرف دیا ہے کہ ترقی وترویج کے لئے خدا کی نظر میں مقبول ہونے کے لئے بڑے بڑے دعویٰ اور فصیح تحریروں کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ "عمل" کی ضرورت ہوتی ہے۔ صرف عمل سے ہی دینی و دنیاوی بھلائی حاصل ہوسکتی ہے۔

سرسید احمد خان مضامین میں منافقت اور تعصوبیت سے قطعی کام نہیں لیتے تھے اور جو بات کہنی ہوتی تھی بڑی آزادی کے ساتھ صاف کہہ دیتے تھے۔ سرسید کے مضمون نویسی کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے قدیم موضوعات کو نئے اسلوب نگارشات کے ساتھ اس طرح پیش کیا کہ وہ ایک نئی چیز معلوم ہونے لگتے۔ سرسید احمد خان کا انداز بیان مذہبی مضامین لکھتے وقت اکثر مناظرانہ ہوجاتا تھا۔ مذہبی مقالات میں مذہبی معقولات سے استفادہ سرسید کے مضامین کی خاص صفت ہے۔

فن مقالہ نگاری موجودہ حالت میں درحقیقت سرسید کے زمانے سے قبل عام طور پر رائج نہ تھی۔ سرسید ہی نے اس کو شروع کیا، ترقی دی اور عروج پر پہونچایا۔ اس لیے وہی مقالہ نگاری کے بانی ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں سینکڑوں مضامین اور طویل مقالے بڑی محنت وکاوش اور بڑی لیاقت وقابلیت سے لکھے۔ اور اپنے پیچھے ایک عظیم الشان ذخیرہ مضامین اور بلند پایہ مقالات کا یاد

گاررکھا۔اس کے علاوہ بہت سی مستقل تصانیف میں اُن کی یادگار ہیں۔

سرسید احمد خان اپنے عہد کے نثر نگار تھے ان کے مضامین نے اُردو نثر کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ان کے مضامین سرسید کی عصری معنویت بھی ہے کیونکہ ان مضامین میں پوشیدہ پیغام آج بھی ہماری تہذیبی اور سماجی زندگی کے لیئے کارآمد ہے۔

غرض سرسید کے مضامین و مقالات مختلف پھولوں کا ایسا عطر ہے۔ جو ہمیں ادب کی خوشبو سے معطر کردیتا ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ

کتاب کا نام	مصنف/مرتب کا نام	ناشر/مقام اشاعت	سن اشاعت
انتخاب مضامین سرسید	ایجوکیشنل بک ہاؤس	ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ	1976ء
اردو کا کلاسیکی ادب مقالات سرسید (حصہ اول) مذہبی و اسلامی مضامین	مولانا اسماعیل پانی پتی	مجلس ترقی ادب نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ لاہور	ندارد
اردو کا کلاسیکی ادب مقالات سرسید (حصہ ہشتم) تعلیمی، تربیتی اور معاشرتی مضامین	مولانا اسماعیل پانی پتی	مجلس ترقی ادب نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ لاہور	1962ء

اردو کا کلاسیکی ادب مقالات سرسید (حصہ نہم) ملکی وسیاسی مضامین	,,	,,	ندارد
اردو کا کلاسیکی ادب مقالات سرسید (حصہ دوازدھم) تقریری مقالات	‘‘	,,	ندارد

ثانوی ماخذ

مصنف کا نام	کتاب کا نام	ناشر/مقام اشاعت	سن اشاعت
الطاف حسین حآلی	حیات جاوید	قومی کونسل فروغ اردو زبان نئی دہلی	پانچواں ایڈیشن 2004ء
ثریا حسین	سرسید احمد خان اوران کا عہد	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	1993ء
مولوی عبدالحق	مطالعہ سرسید احمد خان	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	ایڈیشن 2001ء
نورالحسن نقوی	سرسیداوران کے کارنامے	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	دوسراایڈیشن 2005ء

رسائل وجرائد:

1. تہذیب الاخلاق ماہ نامہ علی گڑھ،ستمبر2016ء،جلد35،شمارہ نمبر:9

2. تہذیب الاخلاق ماہ نامہ علی گڑھ،اپریل2018ء،جلد37،شمارنمبر:4

3. فکرونظر سہ ماہی علی گڑھ،ستمبر2018ء،جلد55،شمارہ نمبر:3